مغرب کی
منافقت
بے لگام امریکی سامراج، انسان دشمن یورپی طاقتوں
اور مفلوج اقوام متحدہ کی شیطانی مثلث پر شدید تنقید
UN
اوشو (گرو رجنیش)
مترجم : خالد ارمان

مغرب کی منافقت

بے لگام امریکی سامراج، انسان دشمن یورپی طاقتوں اور
مفلوج اقوام متحدہ کی شیطانی مثلث پر شدید تنقید

اوشو (گورو رجنیش)

ترجمہ: خالد ارمان

نگارشات

نام کتاب: مغرب کی منافقت
مصنف: اوشو (گورو رجنیش)
ترجمہ: خالد ارمان
ناشر: آصف جاوید
برائے: نگارشات پبلشرز، 24۔ مزنگ روڈ، لاہور
PH:0092-42-37322892 FAX:37354205
مطبع: حاجی منیر پرنٹر، لاہور
کمپوزنگ: عبدالستار
سال اشاعت: 2014ء
قیمت: -/240 روپے

ابتدائیہ

قارئینِ محترم! آداب۔۔۔ لگ بھگ پورے ایک سال کی طویل۔۔۔ یا شاید مختصری۔۔۔ غیر حاضری کے بعد پھر حاضر ہوں۔ بیتے برسوں میں آپ نے میرے لفظوں کو پذیرائی بخشی، میری کتابوں کو سراہا اور مجھے اپنی بے پناہ محبت سے نوازا۔ اس بندہ پروری کے لئے شکرگزار ہوں اور امید ہے کہ آئندہ بھی آپ کی حوصلہ افزائی، مشاورت اور تعاون حسبِ سابق حاصل رہے گا۔

زیرِ نظر کتاب گورو رجنیش کے دو لیکچرز، اور دو ضمیموں پر مشتمل ہے۔ پہلا لیکچر اُس نے اپنے عقیدت مندوں کو بمبئی (بھارت) میں 25-دسمبر 1986ء کو دیا تھا اور دوسرا 28-دسمبر کو۔ پہلے پہل اوشو کی یہ تلخ نوائی اُس کے اپنے ہی آشرم کے اشاعتی شعبے کی طرف سے انگریزی زبان میں شائع ہوئی۔ بعد ازاں جنوری 1988ء اور جنوری 1992ء میں اس کتاب کا گرمکھی روپ منظرِ عام پر آیا جو آنند بھارتی کی کاوش تھا۔

گرمکھی متن پڑھتے ہی میں نے اسے اردو میں ترجمہ کرنا شروع کر دیا کیونکہ اوشو کی یہ کتاب اس کی دیگر سینکڑوں کتابوں سے بالکل منفرد اور مختلف تھی۔ میری اس بات کا ثبوت آئندہ صفحات ہیں، جہاں اوشو اپنے خود وضع کردہ مراقبوں کی خشک تفصیلات اور "جدید روحانیت" کی طویل تشریحات۔۔۔ جن سے اُس کی دیگر تمام کتب لبریز ہیں۔۔۔ کے بجائے امریکہ کی "لفظی ٹھکائی" کرتا نظر آئے گا۔

امریکہ کے ساتھ ساتھ اس نے جارحیت پسند یورپی طاقتوں اور ہمارے سابق صدر "رفیق تارڑ" کی طرح بے اختیار اقوامِ متحدہ کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ پہلے لیکچر میں وہ امریکی اور یورپی حکومتوں کی طرف سے کی جانے والی بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے اقوامِ متحدہ کی طرف سے منظور کردہ "بنیادی انسانی حقوق کا متفقہ عالمی اعلامیہ" مسترد کرنے کا اعلان کرتا ہے۔

دوسرے لیکچر میں اوشو نے اقوامِ متحدہ کے مقابلے میں اپنی طرف سے ایک اعلامیہ متعارف کرایا ہے جس میں دس بنیادی انسانی حقوق کا ذکر کیا گیا ہے جن میں خودکشی، قابل شاہی اور عالمی

حکومت کا قیام بھی شامل ہیں۔

کتاب کا اختتام دو ضمیموں پر ہوتا ہے۔ اقوام متحدہ کی طرف سے منظور کردہ "بنیادی انسانی حقوق کا متفقہ عالمی اعلامیہ" ضمیمۂ اول کے طور پر داخلِ کتاب ہے اور یہی وہ دستاویز ہے جسے اوشو کی آتش بیانی نے "جلا کر خاک" کر دیا ہے۔ بقول اوشو اس "جھوٹ کے پلندے" پر دنیا کی کوئی بھی حکومت عمل نہیں کرتی اور اس کی دفعات کو محض کمزور ملکوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کے لئے ہی "برتا" جاتا ہے۔

دوسرا ضمیمہ ہے: اوشو کا مختصر زندگی نامہ۔۔۔ یہ اصل متن میں بھی چند صفحات کی صورت میں موجود تھا لیکن میں نے اس میں ترمیم و اضافہ کر کے ان صفحات کو آپ کے لئے زیادہ معلوماتی بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں شامل اوشو کے اپنے بیانات "نگارشات" ہی کی شائع کردہ کتاب "ایک روحانی گمراہ صوفی کی آپ بیتی" سے ماخوذ ہیں۔ امید ہے کہ یہ ضمیمہ پیدائش سے موت تک، اوشو کی زندگی کے تمام نشیب و فراز کو واضح کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

قارئین! اوشو سے مکمل اختلاف یا مکمل اتفاق یقیناً ممکن نہیں ہے لیکن ہمیں یہ حقیقت ذہن نشین رکھنا ہوگی کہ 2002ء کے اختتام اور 2003ء کے آغاز پر دنیا کا نقشہ جن تغیرات سے دوچار ہے انہوں نے سامراجی ممالک اور اداروں بالخصوص امریکہ اور اقوام متحدہ کے خلاف نفرت کے بین الاقوامی طوفان کی پہلے ہی سے تند لہروں کو مزید خطرناک بنا دیا ہے۔۔۔ ایسی ہی ایک لہر یہ کتاب بھی ہے جو لگ بھگ دو عشرے پہلے اٹھی تھی لیکن ابھی تھمی نہیں۔۔۔ اگر اوشو آج زندہ ہوتا تو یہ عین ممکن تھا کہ امریکہ اُسے اپنے مفادات پر "لفظی بموں" سے حملے کرنے کا "مجرم" ٹھہرا کر بھارت سے اُس کی حوالگی کا مطالبہ کر دیتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

بہرحال، اب میں یہ کہتے ہوئے اوشو اور آپ کے درمیان سے ہٹ رہا ہوں کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ کرتے ہوئے میں نے مقدور بھر کوشش کی ہے کہ گورو رجنیش کا لب و لہجہ اپنی جملہ خصوصیات سمیت برقرار ہے۔ یہ کوشش کیسی رہی؟ اس کا جواب فقط آپ ہی دے سکتے ہیں۔

خالد ارمان
24-مزنگ روڈ، لاہور
Ph:0300-9406883

انتساب

محبت کے ساتھ ...... میخائل گورباچوف کے نام

کتاب کا باطن

یہی وہ منحوس دستاویز ہے جس کی بنیاد پر دنیا کے ہوس پرست ''تھانے دار'' ہر کمزور ملک میں مداخلت کر کے بغاوت بھڑکانے، حکومتیں گرانے اور پھر سے بنانے تک کا ہر مرحلہ اپنے ابلیسی مفادات کے عین مطابق انجام دینے کے لیے جواز تراشتے ہیں۔

○○○○○

؟

پیارے مرشد!

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ بعض عالمی ادارے اپنے تمام تر وسائل و ذرائع استعمال کرتے ہوئے کوشش کرتے ہیں کہ دنیا میں انسانیت کا نام و نشان تک باقی نہ رہے ...... اور پھر یہی انسان دشمن ادارے ہمیں ''انسانی حقوق کا عالمی دن'' منانے کی ترغیب دیتے ہیں۔

سچے مرشد!

ایسا کیوں ہوتا ہے اور یہ سب کچھ کون کر رہا ہے، اس بھیانک ناٹک کے اصل کرداروں کے حقیقی مقاصد کیا ہیں اور انسانیت سے یہ سنگین مذاق آخر کب تک جاری رہے گا؟

آپ ان سوالات پر لب کشائی فرمائیں تا کہ ہم شک کے اندھیرے سے یقین کی روشنی تک پہنچ سکیں۔

امریکا' یورپ اور انسانی حقوق

یہ سب سے بڑی اور بنیادی بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ ہم ایک منافق سماج میں جی رہے ہیں۔

ایک بہت بڑے مفکر سے کسی نے پوچھا: ''تہذیب کے حوالے سے آپ کا کیا خیال ہے۔''

مفکر بولا: ''یہ ایک دلچسپ تصور ہے مگر حقیقت نہیں۔ کاش کوئی اس تصور کو حقیقت میں بدل دے۔ تہذیب ابھی رونما نہیں ہوئی۔ فی الحال تو یہ مستقبل کا ایک دلکش خواب ہے۔''

یہ کڑوا سچ ذہن نشین کرلو کہ جو لوگ طاقتور ہیں اور جو طبقے مذہبی' سماجی اور سیاسی سطح پر بااختیار ہیں' وہ محض اس لیے مقتدر اور زورآور ہیں کہ تہذیب ابھی تک رونما نہیں ہوسکی ہے۔

کسی مہذب سماج کو ..... اور شرفِ انسانی کے حامل فرد کو..... ریاستوں کی احتیاج نہیں ہوتی۔ کیونکہ تمام ریاستی اور حکومتی حدود وقیود مصنوعی ہیں۔ تہذیب یافتہ سماج اور اعلیٰ انسان کو مذاہب کی ضرورت بھی نہیں ہوتی کیونکہ مذہبی ادبیات محض قصے کہانیاں ہیں۔

جو لوگ..... مثلاً پروہت' سیاستدان اور سرمایہ دار وغیرہ ..... ہزاروں سال سے طاقتور چلے آرہے ہیں' ان کے پاس انسانی ترقی کا عمل روکنے کے لیے درکار قوت بدرجۂ اُتم موجود ہے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانی ترقی آخر کیسے رُک سکتی ہے؟ اس کا جواب دل کے کانوں سے سننے کے قابل ہے۔ سنو! اور اس بات کو گرہ میں باندھ لو کہ انسانیت کی بہبود روکنے کا سب سے مؤثر حربہ یہ ہے کہ انسانوں کو یقین دلا دیا جائے کہ تم تو تہذیب یافتہ ہو۔

تسلیم کرلو کہ انسانی ترقی روکنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ افراد کو بار بار یہ یقین دہانی کرائی جائے کہ تم انسان ہی تو ہو۔ تمہیں خود میں کوئی تبدیلی لانے کی قطعاً

ضرورت نہیں اور اگر تم اس کے لیے کوشش کرنا چاہتے ہو تو تمہارا ایسا ہر ارادہ سراسر فضول ہے۔

اور انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ ..... یہ بات اچھی طرح جانتے ہوئے بھی کہ تہذیب نام کی کوئی چیز نہیں اور انسانی آزادی کے تمام نعرے سراب ہیں.....اُن تمام جھوٹے لفظوں پر ایمان لے آتا ہے جو سیاستدانوں کی زبانیں اگلتی ہیں' جو پروہتوں کے ہونٹوں سے ادا ہوتے ہیں اور جو درسی استاد رٹے چلے جاتے ہیں۔ انسان اس دروغ گوئی پر اس لیے اعتبار کر لیتا ہے کہ اعتبار کرنا بہت آسان ہے' اس کے لیے تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا' سوائے اعتبار کرنے کے۔

لیکن اس سچائی کی تصدیق ..... کہ تم ابھی انسان نہیں ہو..... ایک انتہائی پراسرار خوف کو جنم دیتی ہے اور اس خوف میں مبتلا ہو کر تمہاری حالت نہایت عبرتناک ہو جاتی ہے۔ تمہیں یوں لگتا ہے' جیسے کسی نے یہ سچائی بیان کر کے تمہارے پاؤں تلے کی زمین کھینچ لی ہو۔

جب سچ تمہیں سر سے پاؤں تک برہنہ کر دیتا ہے تو تمہارے ہاتھ منافقت کے پردوں اور جھوٹ کے لبادوں تک نہیں پہنچ پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی سچ کا طلب گار نہیں ہے بلکہ ہر کوئی یہی مان لینے پر تلا ہوا ہے کہ "سچ تو مجھے معلوم ہی ہے۔"

کیا تم نے کبھی اس نفسیاتی چالبازی کے بارے میں سوچنے کی زحمت اٹھائی ہے؟ اب تم پوچھو گے کہ کس چالبازی کے بارے میں۔ تو میں وضاحت کیے دیتا ہوں۔ غور کرو! جس نفسیاتی چالبازی کی ہولناکی پر میں تمہیں سوچنے کی دعوت دے رہا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر تم اپنے پڑوسی کو کسی چیز سے محروم رکھنا چاہتے ہو تو اُسے یقین دلاؤ کہ "تم تو پہلے ہی سے اس چیز کے مالک ہو" .....اُسے ورغلاؤ' بہلاؤ' پھسلاؤ اور یہ جھوٹ مسلسل دہراؤ کہ جو چیز تمہارے پاس ہے' اُس کے حصول کے لیے تمہاری تگ و دو غیر ضروری ہے۔ یہ "سفید جھوٹ" اتنی بار بولو کہ ایک "سیاہ سچ" پیدا ہو جائے...... روشن اذہان کو تاریک کر دینے والا سیاہ سچ۔

آج تم سے یہی جھوٹ منوایا جا رہا ہے' یہ ایک المیہ ہے لیکن اس سے بھی بڑا المیہ یہ ہے کہ تم اس جھوٹ پر اعتبار کرنے کے لیے خود کو ہمہ وقت آمادہ پاتے ہو۔

یہی گمراہ کن آمادگی آنے والی نسلوں تک سرایت کر جائے گی۔ کیوں؟ اس لیے کہ جب تمہارے گردوپیش اور اطراف و جوانب میں زندگی بسر کرنے والے لاکھوں بلکہ کروڑوں لوگ ..... حتیٰ کہ تمہارے اپنے ماں باپ' استاد' مذہبی رہنما اور اقارب ..... تمام کے تمام اس بات پر یقین رکھتے ہوں کہ ہمیں جو جھوٹ سنایا جا رہا ہے' وہی سچ ہے' تو ایسی صورتحال میں یہ

بالکل ہی ناممکن ہے کہ دنیا میں آنے والے نئے لوگ...... یعنی چھوٹے بچے ..... ان ہزاروں سال قدیم یقین دہانیوں کے قائل نہ ہوں۔

ہاں' تو اب سنو سب سے پہلی بات ..... اور میں چاہتا ہوں کہ تم اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لو...... کہ ہم اب بھی جنگلی ہیں' وحشی ہیں اور غیر مہذب ہیں۔ ہزاروں سال سے ہمارے جو چلن رہے ہیں وہ کسی جنگلی اور وحشی ہی کے ہو سکتے ہیں' مہذب انسان کے نہیں۔ انسانی تاریخ کے تین ہزار سال میں پانچ ہزار جنگیں ..... اور تم انسان کو مہذب کہتے ہو؟

بیسویں صدی میں ..... بیسویں صدی کے عین نصف میں تم ایڈولف ہٹلر پیدا کر سکتے ہو' مسولینی پیدا کر سکتے ہو' ماؤزے تنگ پیدا کر سکتے ہو..... اور اس کے باوجود بھی یہ سوچتے ہو کہ انسان مہذب ہو گیا ہے۔

صرف ہٹلر ہی نے لاکھوں انسانوں میں موت بانٹ دی ..... اور وہ بھی بہت منفرد انداز میں۔ اس سفاکانہ عمل میں سائنس اور جدید ٹیکنالوجی بھی استعمال کی گئی۔ گیس چیمبروں میں دس لاکھ یہودیوں کو زندہ جلا کر بھسم کر دیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں لوگ چمنیوں سے باہر نکلتے دھوئیں میں تبدیل کر دیئے گئے۔ اُس نے اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو ہلاکت کی وادی میں دھکیلا کہ "ایک لاش اور ایک قبر" کا روایتی طریقہ اختیار کرنا ممکن ہی نہ رہا۔

اس سے پہلے انسان اتنا غریب کبھی نہ تھا کہ بھکاریوں کو بھی برائے مدفن دو گز زمین تو مل ہی جایا کرتی تھی۔ لیکن ہٹلر نے اس قدر وسیع پیمانے پر انسان کُشی کی تھی کہ اگر سب مقتولوں کو الگ الگ قبر نصیب ہو جاتی تو پورے کا پورا جرمنی قبرستان بن جاتا۔ اپنے ابلیسی جرائم زمین کے پیٹ میں چھپانے کے لیے اس نے بے شمار گہرے گڑھے کھدوائے۔ لاشوں کو ان موت کے گڑھوں میں پھینک کر اوپر مٹی ڈال دی جاتی۔ لیکن اس سے پہلے مقتولوں کی جامہ تلاشی ضروری تھی۔ بے جان جسموں سے لباس نوچ لیے جاتے اور اس عمل میں جو اشیاء ہاتھ آتیں انہیں اہتمام سے برباد کر دیا جاتا۔ مقتولوں کی شناخت ناممکن بنانے کی غرض سے اُن کی مونچھیں' داڑھیاں اور سر مونڈ دیے جاتے۔ اکثر اوقات سر تن سے جدا کر دیا جاتا۔ سر کٹی لاش کو مزید کئی ٹکڑوں میں تقسیم کیا جاتا۔ یوں سر کہیں ہوتا اور پاؤں کہیں' ٹانگیں ایک جگہ ہوتیں تو ہاتھ کسی دوسری جگہ۔ ان گنت لاشوں کے ساتھ یہی سلوک کیا گیا۔ ایسے میں اگر کوئی تلاش اور شناخت بھی کرتا تو کس کو؟ لاتعداد کٹی پھٹی اور متعدد ٹکڑوں میں بٹی متعفن لاشوں کی شناخت کا امکان سرے سے ختم ہی کر دیا گیا تھا۔

ہٹلر نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟ تاکہ دریائے اَجل میں غرق ہونے والوں کو بے چہرہ اور بے شناخت کردیا جائے یہاں تک کہ مقتولین کو اُن کے جسم کے کسی ایک ٹکڑے سے بھی شناخت کرنا ممکن نہ رہے۔ اُس نے زندہ انسانوں کو مردہ اعضاء میں بدل کر رکھ دیا......اورتم کہتے ہو کہ آدمی مہذب ہوگیا ہے۔

انسانی وحشت کی یہ کہانی یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد اگر یہ احساس عالمگیر سطح پر فروغ پالیتا کہ اب فراست اور دانائی کی ضرورت ہے' خونریزی کی نہیں' تو جنگ عظیم دوم اقوام عالم کے مابین آخری جنگ ثابت ہوسکتی تھی۔ اب بھی موقع ہے' کم از کم جو قابل مذمت اور غیرانسانی سلوک انسان اپنے ہی جیسے دیگر انسانوں سے روا رکھے ہوئے ہے' اُسے ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے تو یہ بات آسانی سے سمجھ لینی چاہیے کہ امن ہی انسانیت کی آخری پناہ گاہ ہے۔ لیکن نہیں' ہم تیسری عالمی جنگ کی تیاریاں کررہے ہیں۔

البرٹ آئین سٹائن سے پوچھا گیا ''تیسری عالمی جنگ کے اثرات کیا ہوں گے۔''

وہ بولا: ''تیسری کا تو علم نہیں لیکن چوتھی کے بارے میں میں ضرور کچھ کہنا چاہوں گا۔''

سوال پوچھنے والا حیران رہ گیا۔ اُسے اس جواب کی قطعاً توقع نہ تھی' لہٰذا بولا: ''یہ بھلا کیا بات ہوئی؟''

آئین سٹائن نے کہا: ''آپ سمجھے ہی نہیں۔ دراصل میں چوتھی عالمی جنگ کے بارے میں انتہائی دوٹوک اور غیرمبہم انداز میں یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ یہ کبھی ہوگی ہی نہیں۔ کیونکہ تیسری عالمگیر جنگ ہی زندگی کو زمین کی آغوش سے مکمل طور پر ختم کردے گی۔ ہر چیز فنا ہوجائے گی۔ صرف انسان اور پھول ہی نہیں' ہر جاندار ہمیشہ کے لیے اس دھرتی سے رخصت ہوجائے گا۔''

اورتم کہتے ہو کہ انسانیت مہذب ہوگئی ہے۔

نہیں' تمہیں دھوکہ دیا گیا ہے۔ انجمن اقوام متحدہ کا منظور کردہ بنیادی انسانی حقوق کا متفقہ عالمگیر اعلانیہ بھی منافقت اور پاکھنڈ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ جارج گرجیئیف ایک مختصر سی کہانی سنایا کرتا تھا' اور وہ کہانی انسانیت کے ضمن میں بالکل سچی ہے۔ کہانی یہ ہے کہ:

''ایک تھا جادوگر۔ وہ دشوار گزار پہاڑوں اور گھنے جنگلوں میں رہا کرتا تھا۔ اُس نے ہزاروں بھیڑیں پال رکھی تھیں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ تمام بھیڑیں جادوگر سے خوفزدہ رہا کرتی تھیں۔ کیونکہ وہ ہر روز مشاہدہ

کرتی تھیں کہ اُن میں سے ایک ناشتے کے لیے کاٹ لی جاتی ہے اور دوسری دوپہر کے کھانے کے لیے چھری تلے آجاتی ہے۔ اسی لیے آہستہ آہستہ وہ جادوگر کے ہاں سے فرار ہونے لگیں۔ قرب و جوار میں پھیلے وسیع و عریض جنگل اور پہاڑی سلسلے میں فرار ہو جانے والی بھیڑوں کی تلاش انتہائی مشکل اور جان لیوا عمل تھا۔ بھیڑوں کا مالک چونکہ جادوگر تھا لہٰذا اُس نے جادو کا استعمال کیا۔ اُس نے تمام بھیڑوں کو ورغلایا اور ہر بھیڑ کے کان میں کچھ نہ کچھ پڑھ کر پھونک دیا۔ کچھ بھیڑوں کو اُس نے کہا کہ تم تو انسان ہو۔ تمہیں مجھ سے خوفزدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ کھانے کے لیے تو صرف بھیڑ ہی کاٹی جائے گی' تمہیں اس سے کیا غرض۔ کیونکہ تم تو میری طرح انسان ہو۔ کچھ اور بھیڑوں سے اُس نے کہا کہ تم تو شیر ہو۔ بھیڑیں تو ڈرا ہی کرتی ہیں' ڈرپوک جو ہوتی ہیں' بھاگ بھی جاتی ہیں۔ لیکن تم شیر ہو' تمہیں تو فرار ہونے کی بجائے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنی چاہیے۔ کیونکہ شیر ہونے کے باعث یہی رویہ اختیار کرنا تمہاری بہادری اور قوت کا تقاضا ہے۔ بھیڑوں کے طبقے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا اُن کا کٹ مرنا تمہارا مسئلہ نہیں۔ وہ تو بنائی ہی اس لیے گئی ہیں کہ انہیں مارا جائے۔ لیکن تم تو اس جنگل میں میرے بہترین دوستوں میں سے ہو۔

یوں اُس نے تمام بھیڑوں کو مطمئن کردیا۔ اگلے ہی دن سے بھیڑوں کے فرار ہونے کا سلسلہ بند ہوگیا۔ وہ اب بھی پہلے ہی کی طرح ہر روز کسی نہ کسی بھیڑ کو چھری تلے گردن کٹواتے دیکھتیں لیکن اب انہیں اس عمل پر کوئی تشویش نہیں ہوتی تھی۔ کوئی شیر تھی' کوئی ببر شیر تھی' کوئی انسان تھی اُن میں کوئی بھیڑ تو تھی ہی نہیں' سوائے اُس کے جو ہر روز مر جاتی تھی۔ جو ماری جاتی تھی صرف وہ ہی بھیڑ ہوتی تھی۔

اس طرح وہ جادوگر بغیر کسی کو ملازم رکھے ہزاروں بھیڑوں کو قابو میں رکھتا تھا۔ وہ بھوک مٹانے اور گھومنے پھرنے جنگلی چراگاہوں کو جاتیں

اور یہی اعتماد دل میں لیے واپس آ جاتیں کہ "وہ کوئی اور بھیڑ ہوگی جو تیز دھار چھری تلے دم توڑے گی۔ ہم نہیں۔ ہم اس ہجوم کا حصہ نہیں ہیں۔ ہم تو مطمئن ہیں' عزت اور احترام یافتہ ہیں اور اس عظیم جادوگر کی دوست۔" یوں اُس جادوگر کی تمام مشکلات حل ہوگئیں۔

میں نے یہ کہانی تمہیں اس لیے سنائی ہے کیونکہ یہ لفظ بہ لفظ تم پر صادق آتی ہے۔ تمہیں کچھ باتیں سمجھائی گئی ہیں۔ اور تم اپنے گرد و پیش کا تجزیہ کر کے یہ معلوم کیے بغیر کہ اُن کا حقیقت سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے' انہیں قبول کر لیتے ہو۔

اب اقوام متحدہ کے انسانی حقوق سے متعلق اُس اعلامیے کی طرف آؤ' جسے میں کچھ ہی دیر پہلے محض منافقت اور پاکھنڈ قرار دے چکا ہوں۔ میں اس اعلامیے کی بھرپور مذمت کرتا ہوں اور تم سے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ حقوق صرف فرائض ہی کی اساس پر استوار ہو سکتے ہیں۔ فرائض جڑیں ہیں اور حقوق ان جڑوں سے قوت پا کر پروان چڑھے درخت کے پھل کا درجہ رکھتے ہیں۔ فرائض کی ادائیگی کے بغیر تمہارے لیے حقوق کا حصول ناممکن ہے۔ تم خود ہی سوچو' یہ کتنی ستم ظریفانہ یک رُخی ہے۔ سال بھر میں کسی ایک دن انسانی حقوق کے راگ الاپنا..... میں پوچھتا ہوں' یہ لوگ "انسانی فرائض کا عالمی دن" کیوں نہیں مناتے جو کہ مقدم ہیں۔

"انسانی حقوق" کا ڈھول پیٹنے والے منافق لوگ "انسانی فرائض" کی بات کیوں نہیں کرتے؟ کبھی سوچا ہے تم نے۔ میں بتاتا ہوں۔ غور سے سنو۔ انسانوں کے بنیادی حقوق کی حفاظت کا پرچم لہرانے والے "انسانی فرائض" کی بات اس لیے نہیں چھیڑتے کہ وہ تمہیں تمہارے غصب شدہ حقوق واپس کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہیں۔ اگر فرائض کا کچھ پاس نہ ہو تو حقوق کے بارے میں کھوکھلے اور بے معنی لفظوں سے سوائے گمراہ کن پروپیگنڈے کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن اس سے تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آنے والا۔ عالمی سیاسی قوتوں کے جن گماشتوں نے "بنیادی انسانی حقوق کا مشترکہ اعلان نامہ" تیار کیا ہے' اُنہیں انسانی فرائض کا تو کچھ بھی پاس ولحاظ نہیں ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ تمام انسان برابر ہیں۔ اب لازماً یہ بات افراد کی عام اکثریت کی مجروح انا کے لیے مرہم کا درجہ رکھتی ہے اور یہ فقرہ احساس محرومی کا شکار دنیا کی بہت بڑی آبادی کے لیے تسکین کا باعث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً کوئی بھی ایسا کہنے یا لکھنے پر احتجاج یا

مذمت نہیں کرتا' حالانکہ انسانوں کے لیے اس طرح کے خیالات کا اظہار ایک نہایت بھدا اور خطرناک جھوٹ ہے۔

میرے خیال میں سب کے سب تو رہے ایک طرف' دنیا کے کوئی سے دو افراد بھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے' ایسا ہونا کسی طرح بھی ممکن نہیں' کسی پہلو سے بھی ممکن نہیں' یہ کہہ کر دراصل میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دو افراد میں مقابلہ یا موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے انسانی سطح پر مساوات یا عدم مساوات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیا تم میں اور اس کمرے کے ستونوں میں مساوات ہے؟ ہاں' یہ ستون خوبصورت تو ہو سکتے ہیں' لیکن ان میں اور تم میں کوئی مساوات نہیں ہے۔ واضح رہے کہ میں یہ ہرگز نہیں کہہ رہا کہ تم ان بے جان ستونوں سے بھی گئے گزرے ہو بلکہ میرے کہنے کا صرف اور صرف یہ مطلب ہے کہ ستون' ستون ہیں اور تم' تم ہو۔

ہر آدمی خود ہی اپنی مثال ہے لہٰذا جب تک ہم فردی انفرادیت کو ہر ایک کے لیے تسلیم نہیں کرتے' تب تک کسی قسم کے کوئی انسانی حقوق نہیں ہو سکتے اور نہ ہی ایسی مہذب دنیا بسائی جا سکتی ہے جو انسانی ہو' محبت سے معمور ہو اور پرامن ہو۔

اُس اعلامیے میں انہوں نے اس بات پر بار بار زور دیا ہے کہ تمہیں دوسرے انسانوں سے اپنے بھائیوں کی طرح پیار کرنا چاہیے لیکن کیا کبھی تم نے بھائیوں کو ایک دوسرے کے دائمی خیرخواہ اور دوست ہوتے دیکھا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ جیسے شدید عناد کے ساتھ دو بھائی برسرپیکار ہوتے ہیں' شاید کوئی بھی نہ ہوتا ہو۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ "تم آپس میں بھائی بھائی ہو۔" یہ محض نعرہ بلند کر دینے سے ہی سچ نہیں بن جائے گا۔ جنہوں نے انسانی حقوق کا یہ اعلامیہ جاری کیا ہے' انہیں ایسا کرنے کا حق دیا کس نے ہے؟ میں پوچھتا ہوں' وہ ہوتے کون ہیں ایسا کرنے والے؟ ایک طرف انسانی حقوق کی باتیں اور دوسری طرف ہر لڑائی میں شرکت۔ ایک طرف امن کی تمنا اور دوسری طرف ہر لڑائی کی حوصلہ افزائی۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کے ہر خطے میں جلتی پر تیل ڈال کر جنگ کے شعلے بھڑکائے ہیں اور پھر ان شعلوں کو ہوا دی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو عالمی تشدد اور بدامنی کا سبب ہیں۔

یاد رکھو! یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے آدھی انسانیت کو یعنی عورتوں کو غلام بنا کر رکھا ہوا ہے..... لیکن اس اعلامیے کا جائزہ لیتے ہوئے مجھے بہت مزہ آیا کیونکہ اُس میں "بھائیوں" کے بارے میں تو بہت کچھ درج ہے لیکن "بہنوں" کا کوئی ذکر نہیں۔ حالانکہ عورتیں اپنی تعداد کی وجہ سے "آدھی انسانیت" کا درجہ رکھتی ہیں۔

دراصل یہ سیاستدان بہت بڑے مداری ہوتے ہیں ..... لفظوں کے مداری۔ چند کھوکھلے الفاظ کی رسی کو سانپ بنانا انہی کا کمال ہے۔ یہ چالباز' فریبی' دروغ گو اور انسان دشمن ''قانونی کاروبار'' کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مرد اور عورت کے درمیان' کالے اور گورے کے مابین کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ اُن کا قول ہے کہ نسل' مذہب اور سیاسی نظریاتی دھاروں کے اختلافات کی بنیاد پر انسانوں میں کسی قسم کی کوئی تفریق قائم نہیں کی جانی چاہیے...... اب کوئی انہیں گریبان سے پکڑ کر پوچھے کہ مذہبی' نسلی اور سیاسی اختلافات کے بیج بو کر انہیں جنگ کے درخت بنانے میں کون کوشاں ہیں؟ یہ وہی لوگ ہیں جو انسانی حقوق کا پرچم لہرا رہے ہیں۔ انہوں نے صدیوں سے عورت کو غلام بنا رکھا ہے' اور اب بھی وہ اس جنس کو آزادی دینے سے انکاری ہیں حالانکہ یہ ان کے تخلیق کردہ اعلامیے کے مطابق بنیادی انسانی حقوق میں شامل ایک بڑا حق ہے۔

وہ آج بھی سیاہ فام لوگوں کو محض جانور سمجھنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کے ساتھ باقاعدہ طور پر جانوروں جیسا سلوک بھی روا رکھتے ہیں۔ تہذیب کے دعویداروں کی حالت تو دیکھو کہ انیسویں صدی کے اواخر تک وہ لوگوں کی خریدوفروخت میں مشغول تھے..... کسی میز یا کرسی کی طرح ان کی بھرے بازار میں نیلامی ہوتی تھی۔ اور اب بھی مغرب میں جو سماجی وقار اور احترام سفید چمڑی والوں کو حاصل ہے' سیاہ فام اس کا خواب بھی دیکھیں تو مجرم ٹھہرائے جاتے ہیں۔ تم دیکھ سکتے ہو' وہاں سارے کا سارا سیاسی کاروبار سفید فام تاجر ہی چلا رہے ہیں۔ تاریخ اٹھا کر دیکھ لو' ان سفید فاموں نے صدیوں تک انسانیت کو غلام بنائے رکھا۔ یہ اپنے عظیم سامراجوں پر فخر کرتے تھے۔ سب سے بڑا سامراجی ملک برطانیہ تھا اور کہا جاتا تھا کہ برطانوی مملکت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔ برٹش سامراج کے زیرِ تسلط خطوں میں کہیں نہ کہیں سورج چمکتا ہی رہتا تھا کیونکہ کرۂ ارض کے کسی نہ کسی خطے میں تو دن ہی ہوتا تھا۔

انگلستانیوں کی طرح دیگر سفید فام اقوام بھی اس دوڑ میں بقدرِ استطاعت شریک تھیں۔ وہ کیوں کسی سے پیچھے رہتیں۔ فرانسیسی' پرتگالی اور اسپینی ..... ان سب نے اپنے اپنے وسیع و عریض سامراج تشکیل دے رکھے تھے۔ یہ وہ قومیں ہیں' جنہوں نے زمین اور زمینی وسائل کو جی بھر کر لوٹا۔ تاریخی طور پر وہ دوسروں کے سہارے ایک آسان اور پرتعیش زندگی بسر کرنے والے رہے ہیں۔ یہ آسان زندگی دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈال کر' بغیر فرائض ادا کیے' آسان ہوئی تھی۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ یہی قومیں اب انسانی حقوق کی فہرست بنا کر

اس کی تشہیر کر رہی ہیں: ''اس سادگی پہ کون مر نہ جائے اے خدا۔''

یہ تو وہی بات ہوئی کہ ''وہی قتل بھی کرے ہے' وہی لے ثواب الٹا۔'' یہ فریب' جھوٹ اور چالبازی ہے۔ وہ جو کہہ رہے ہیں' خود اُس پر عمل کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہیں۔ یہ سارا ناٹک تو صرف تمہارے ذہنوں میں یہ سوچ پیدا کرنے کے لیے رچایا جا رہا ہے کہ تم سب ایک جیسے ہو' برابر ہو' بھائی بھائی ہو۔ وہ تمہیں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ فلاں فلاں قسم کے انسانی حقوق تو پہلے ہی سے تمہارے پاس ہیں۔

لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ سب انسانی حقوق محض پاکھنڈ اور انسانیت سے دغا ہیں اور یہ بات مجھے اپنے ذاتی تجربے سے معلوم ہے۔

ان کے جاری کردہ اعلامیے میں انسانوں کے جو حقوق گنوائے گئے ہیں' اُن میں ایک حق یہ بھی ہے کہ کسی کو بغیر عدالتی اجازت نامے یا وارنٹ کے حراست میں نہ لیا جائے۔ لیکن میں بالکل اسی طرح گرفتار ہوا یعنی بغیر عدالتی اجازت نامے کے۔ تہذیب یافتہ امریکی سرزمین پر مجھے گرفتار کرنے والوں کے پاس تلاشی کا وارنٹ تھا' نہ گرفتاری کا۔ یہاں تک کہ انہوں نے مجھے زبانی طور پر بھی یہ بتانا پسند نہ کیا کہ میرا قصور کیا ہے۔ پھر جب میں نے خود یہ پوچھا کہ مجھے کس جرم میں گرفتار کر رہے ہو تو جواب دینے کی بجائے مجھ پر اسلحہ تان لیا گیا۔ یہ تھا ان کا جواب۔ میرے جیٹ ہوائی جہاز کو بھی مسلح لوگوں نے گھیر لیا۔ جب کسی جائز سوال کا جواب ''بندوق تان لینا'' ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ تہذیب ابھی بہت دور ہے۔

میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ان کے پاس کوئی ایسا عدالتی اجازت نامہ نہ تھا جس کی بنیاد پر مجھے گرفتار کیا جاتا یا میری تلاشی لینا ممکن ہوتا۔ عدالت کے لیے یہ ایک سیدھی سادی اور عام بات ہوتی ہے کہ ..... لیکن عدالت کی بات چھوڑیں پہلے تو یہ دیکھیں کہ انہوں نے مجھے محض گرفتار ہی نہیں کیا بلکہ میرے ساتھ سنگین نوعیت کی دھوکے بازی بھی کی۔ مجھے جان بوجھ کر ایسے وقت میں گرفتار کیا گیا جب جیل میں دو دن رہنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا۔ ہفتے اور اتوار کے بعد سوموار کو عدالت کے دروازے کھلیں گے تو میں ضمانت پر رہا کیا جا سکوں گا۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ میری ضمانت ہو جائے گی کیونکہ مجھے حراست میں لینے کا کوئی ٹھوس جواز ہی موجود نہ تھا ..... مجھے حراست میں لینے والوں' بلکہ ہراساں کرنے کی ناکام کوشش کرنے والوں کے پاس ثبوت تھا نہ کوئی شک و شبہ۔ اسی وجہ سے انہوں نے میری گرفتاری کے لیے ایسے وقت کا انتخاب کیا جب عدالت دو روز کے لیے بند تھی تاکہ انہیں مجھے ستانے

اور تنگ کرنے کے لیے کچھ وقت مل جائے۔ مگر تیسرے دن جب عدالت نے بھی میری درخواست ضمانت مسترد کر دی تو مجھے ذرا بھر بھی حیرانگی نہیں ہوئی تھی۔

عدالت کی خاتون مجسٹریٹ نے میرے وکلاء کو یہ بات پوچھنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا کہ آخر ان کے مؤکل کو بغیر کسی وجہ اور وارنٹ کے کیوں پکڑا گیا۔ امریکہ جیسے جمہوری ملک میں ..... جو کہ سب سے بڑا جمہوریت پسند ہونے کا دعویدار ہے ..... عدالت اس قسم کے سوال کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتی۔ کیونکہ ایسا کرنے سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جانے کا خطرہ تھا۔

ذرا سوچو! میری ضمانت ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ پہلے تو مجھے بغیر کسی عدالتی اجازت نامے کے گرفتار کیا گیا اور اب تین دن گزرنے کے باوجود بھی وہ اس نوعیت کی کوئی دستاویز پیش کرنے سے قاصر تھے جس کی رو سے میری گرفتاری یا تلاشی کی کوئی بنیاد فراہم ہو سکتی۔ اصولی طور پر تو میں گرفتار ہی نہیں تھا' لہٰذا ضمانت کیسی؟ اسی وجہ سے ''انسانی حقوق'' اور ''انصاف کے تقاضوں'' کے عین مطابق میری درخواست ضمانت مسترد کر دی گئی۔

مقامی عدالت میں جو گزری' تم سن چکے ہو۔ بعدازاں ریاستی عدالت میں بھی یہی سوال سامنے آیا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات والا رہا۔ وہ میری گرفتاری کا ٹھوس جواز پیش نہیں کر سکتے تھے۔ اس سوال کے جواب میں ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا لہٰذا اس عدالت میں بھی ہمارا مؤقف ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا گیا۔ آگے کیا ہوا؟ یہ ایک لاحاصل اور بے معنی قصہ ہے' اصل بات یہ ہے کہ پہلے تو تم ایک آدمی کو گرفتار کرتے ہو اور پھر یہ بھی نہیں بتا پاتے کہ آخر اس کا جرم کیا ہے۔

''انسانی حقوق کے مشترکہ عالمی اعلان'' میں تو یہ لکھا ہے کہ کسی کو بغیر وارنٹ گرفتار نہیں کیا جا سکتا اور یہ نعرہ بھی امریکہ کی سرزمین سے خاص طور پر زیادہ بلند آواز میں لگایا جا رہا ہے۔ جو میرے ساتھ ہوا۔ اُسے ذہن میں رکھ کر سوچو کہ کیا یہی بنیادی انسانی حقوق ہیں۔ اگر میں وہاں گرفتار نہ ہوتا تو شاید ذاتی طور پر کبھی بھی نہ جان پاتا کہ لفظوں کے طوطے مینا اڑانے والوں کا اپنا کیا حال ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ کوئی بھی آدمی کسی دوسرے کے نظریات' مذہب اور سیاسی خیالات میں دخل انداز نہیں ہو سکتا کیونکہ ذاتی نظریات رکھنا اور ان پر عمل کرنا ہر کسی کا پیدائشی بنیادی حق ہے۔ لیکن امریکہ میں میرا مرکز اس لیے تباہ و برباد کر دیا گیا کہ عیسائیت ..... میں سفید فام نہیں

تھا۔ میرا مرکز تو ایک ایسی جگہ تھی جہاں تمام ملکوں اور پورے کرۂ ارض سے تعلق رکھنے والا فردی آزادی کا استحقاق حکمران تھا۔ میرے ساتھ سیاہ فاموں سمیت سبھی لوگ شامل تھے۔ یہ ایک ایسا مرکز تھا جہاں کسی بھی قسم کا کوئی اختلاف نہ تھا۔ میرا کمیون درہم برہم کر کے اصل میں انہوں نے ایک ایسے مرکز کو ختم کر دیا جو انسانی حقوق کو ان کی تمام تر جزئیات سمیت پورا کر رہا تھا۔

سطحی طور پر دیکھنے سے شاید یہی لگتا ہے کہ انسان مہذب ہو گیا ہے لیکن انسانی ذات کی گہرائیوں میں جھانکیں تو یہ حقیقت معلوم ہو گی کہ اپنے لاشعور کی تاریکیوں میں وہ اب بھی جنگلی ہے' غیر مہذب ہے۔

مذکورہ اعلامیے کی تمہید میں کہا گیا ہے کہ ہم مذہب یا عقیدے پر استوار ہر طرح کے اختلافات اور عدم برداشت کو مٹانے کے لیے بالکل تیار ہیں۔

اگرچہ اعلامیے میں یہ فقرہ شامل کرنے کے سوال پر بہت سے ملکوں کے نمائندوں کے سروں میں پرجوش اثباتی جنبش پیدا ہوئی ہو گی لیکن میں یقین سے کہتا ہوں کہ عملاً یہ بات ایک بھی ملک کے حوالے سے سچی نہیں ہے۔ مذاہب مسلسل باہم برسرپیکار ہیں۔ نادان مذہبی لوگوں پر مشتمل حکومتوں کی عملداری میں مذہبی اقلیتوں کو کچلنے کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے۔

انہوں نے یہ ارادہ ظاہر کیا ہے کہ ہم مذہب یا عقیدے پر استوار ہر طرح کے اختلافات اور عدم برداشت کو مٹانے کے لیے بالکل تیار ہیں۔ یہ ارادہ تو اچھا ہے لیکن جن لوگوں نے یہ ارادہ ظاہر کیا ہے' وہ سب کے سب [illegible] ہیں۔

یہاں میں تمہیں یہ بھی بتاتا چلوں کہ انجمن اقوام متحدہ کے جس خصوصی اجلاس میں انسانی حقوق کا مشترکہ عالمی اعلان کیا گیا تھا اس میں سوویت روس سمیت نو سوشلسٹ ممالک غیر حاضر رہے تھے لیکن امریکہ بہادر اگلی نشست پر براجمان تھا۔ یوں اس اعلامیے کو متفقہ طور پر منظوری ملی' کوئی بھی خلاف نہ تھا' سب ہی حامی تھے۔ یہ وضاحت میں نے اس لیے کی ہے کہ مذکورہ اعلامیہ پیش کرنے میں پہل کرنے والا ملک امریکہ تھا۔ یہ وہی امریکہ تھا جو ہر انسانی حق کو پامال کرنے والا بھی پہلا ملک ہے۔

حال ہی میں امریکہ نے نکاراگوا کے دہشت گردوں کو بیس کروڑ ڈالر دیے ہیں۔ نکاراگوا ایک چھوٹا سا ملک ہے جو کیوبا کی طرح سوشلسٹ شناخت کا حامل ہے۔ اس ریاست کی بربادی کے خواہشمند امریکہ نے اس کے چپے چپے کو دہشت گردوں سے بھر دیا ہے۔ ڈالروں کی برسات بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے تاکہ نکاراگوا میں متحرک دہشت گردوں کی

تمام تر ضروریات پوری ہوسکیں؛ جن میں ہتھیاروں کا حصول بھی شامل ہے۔ یہ تو اقوام متحدہ کے کمرے سے باہر کی دنیا کی ایک چھوٹی سی جھلک تھی...... لیکن وہاں بیٹھ کر جو کہا جاتا ہے اُسے کون یاد رکھتا ہے۔ اعلامیے میں اسی منافق امریکہ نے کہا تھا کہ ہر ملک خداداد طاقت کا سرچشمہ ہے اور ایک ملک کو ہرگز یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ کسی دوسرے ملک کے طرز حیات یا نظریات میں دخل انداز ہو۔ کوئی ملک داخلی طور پر کیسا رہنا چاہتا ہے یہ اُس کا نجی اور داخلی معاملہ ہے۔ لہٰذا ایسے پہلوؤں سے کسی دوسرے ملک کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔

لیکن نکاراگوا میں امریکہ نے جو کردار ادا کیا اُسے پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی چھوٹی ریاست نے سوشلزم کو اپنے طرز حیات اور سماجی ڈھانچے کے طور پر اپنا لیا ہے تو اس عمل میں دخل دینے والا امریکہ کون ہوتا ہے؟ امریکہ کو ایسا کرنے کا اختیار کس نے دیا ہے؟ اُس کے پاس کون سا حق ہے جو اُسے دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کی بنیاد فراہم کرتا ہے؟

یہی سوالات نکاراگوا نے عالمی عدالت میں اٹھائے تھے۔ اگرچہ نکاراگوا کی اپیل کی سماعت کرنے والی عالمی عدالت میں امریکہ کا دیا کھا کر اُس کے گیت گانے والے ججوں کی بھرمار تھی لیکن اس کے باوجود عدالت نے امریکہ کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ”آپ کا یہ طرزِ عمل انسانی حقوق اور بین الاقوامی تعلقات کی اخلاقیات کی کھلی خلاف ورزی اور جرم ہے۔“ مگر یہ کھوکھلی تنبیہ رونالڈ ریگن نے جوتے کی متکبرانہ ٹھوکر سے اُڑا دی۔ اُس نے کہا: ”ہمیں عالمی عدالت یا اُس کے فیصلوں کی کوئی پروا نہیں۔“ اب یہی لوگ انسانی حقوق کا ڈھول پیٹتے نہیں تھکتے۔ یہی لوگ عالمی عدالت کو قائم کرنے میں پیش پیش تھے تاکہ کسی بھی بین القومی تنازعہ کی صورت میں فیصلہ ہوسکے اور یہی لوگ ہیں جو اپنی ہی قائم کردہ عدالت کا فیصلہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

کیا تم اس رویئے کے پیچھے کارفرما سیاسی مکاری دیکھ سکتے ہو؟ یہ عالمی عدالتیں اور یہ انسانی حقوق کے اعلامیے...... یہ سب کچھ سچائی کو دبانے اور جھوٹ کو بڑھاوا دینے کے لیے ہے۔ اگر کوئی کمزور ملک غلطی کر بیٹھے تو عالمی عدالت کے فیصلے پتھر پر لکیر ہوتے ہیں اور امریکہ اس قسم کے فیصلوں پر عملدرآمد نہ ہونے کی صورت میں ملزم ملک کو تباہ و برباد کرنے پر کمر باندھ لیتا ہے۔ لیکن جب امریکہ خود مجرم ثابت ہوجائے تو وہ صرف یہ بیان جاری کرکے بات پر مٹی ڈال دیتا ہے کہ ”ہمیں عالمی عدالت یا اس کے فیصلوں کی کوئی پروا نہیں ہے۔“

کتنی بے بس ہے عالمی عدالت اور کتنا اپاہج ہے عالمی ضمیر۔ لیکن بات یہ ہے کہ جب ایسی عدالتوں کے بانی اور تجویز کنندہ ہی نافرمان ہوجائیں تو کیا ہوسکتا ہے۔ عالمی عدالت کے پاس طاقت ہے نہ فوج‘ یہ ایک حقیقت ہے۔ مگر اصولی طور پر دیکھا جائے تو تمام عالمی رہنماؤں کو حاصل اثر و رسوخ اور کرۂ ارض کے تمام ممالک کی فوجی طاقت عالمی عدالت کسی بھی وقت استعمال کرسکتی ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب اس کے فیصلوں کو ماننے میں ہٹ دھرمی اور ناروا ضد کا مظاہرہ کیا جائے۔ ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ جب عالمی عدالت کے فیصلوں پر طاقت کے ذریعے عملدرآمد کرایا گیا‘ لیکن ایسا صرف ان ممالک کے معاملے میں ہوا جو کمزور تھے اور امریکہ سے سیاسی اختلافات رکھتے تھے۔ اسی منافقانہ چلن کا نتیجہ ہے کہ جب خود امریکہ نے عالمی عدالت کے فیصلے کو مسترد کیا تو اقوام متحدہ کا عالمی فوج استعمال کرنے کا اختیار کاغذ کے صفحے پر خراٹے لیتا رہا۔ یہ تو حالت ہے انسانی حقوق کے علمبرداروں کی۔ اب عالمی عدالت اپنی بے بسی کے خلاف کس عدالت میں اپیل کرے کہ ”جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔“

امریکہ نے نکاراگوا کے داخلی معاملات میں مجرمانہ مداخلت کی اور عالمی عدالت کے فیصلے کو مسترد کیا مگر عالمی ضمیر لمبی تان کے سویا رہا۔ اقوام متحدہ کے حلق میں جالے بنے گئے۔ کسی نے اس بدمعاشانہ روش کی مخالفت یا مذمت میں ایک لفظ تک نہ کہا۔ اگر انجمن اقوام متحدہ کے رکن ممالک میں ذرا سی بھی عزتِ نفس اور انصاف پسندی ہوتی تو وہ فوراً ہی اقوام متحدہ کے ساتھ ساتھ عالمی عدالت کو بھی ہمیشہ کے لیے دفن کردیتے تاکہ نہ یہ ادارے ہوں اور نہ کوئی ان کی توہین کرے۔ میں سوویت روس کی تعریف کروں گا کیونکہ وہ انسانی حقوق کے اعلامیے کے عمل میں شریک نہیں ہوا‘ وہ اس جرم میں شریک نہیں ہے۔ اور ایک روس پر ہی کیا موقوف‘ کوئی بھی سوشلسٹ ملک اس سامراجی ناٹک کا کردار نہیں بنا۔ ایسا کرکے ان چند ممالک نے آغاز میں ہی یہ ثابت کردیا کہ انسانی حقوق کے تمام دعوے کھوکھلے ہیں اور ہمیں بیوقوف نہیں بنایا جاسکتا۔

ایک اور زاویے سے دیکھا جائے تو انسانی حقوق کا متفقہ بین الاقوامی اعلان نامہ کئی حوالوں سے نامکمل ہے۔ اس میں کئی بنیادی انسانی حقوق تو شمار ہی نہیں کیے گئے مثلاً میرے خیال میں اپنی مرضی سے بخوشی اپنی جان لے لینا بھی ایک بنیادی انسانی حق ہے لیکن مذکورہ اعلامیے میں اس حق کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ جب آدمی ایک لمبی عمر بسر کرچکا ہو‘ بیمار‘ کمزور اور

بوڑھا ہو چکا ہو' کسی کام کا نہ ہو بلکہ دوسروں پر ناپسندیدہ بوجھ بن گیا ہو تو ایسی حالت میں ایک بے فائدہ اور اذیت ناک زندگی کو جاری رکھنے سے کیا حاصل۔ ایسا آدمی بلاوجہ کیوں تکلیف میں مبتلا رہے' موت کا انتظار کرنا کیا بہت ضروری ہے۔

ہسپتالوں' کلینکوں اور گھروں میں ایسے ہزاروں لوگ ہیں جو دوسروں کے لیے ایک تکلیف دہ اور ناپسندیدہ بوجھ کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ لیکن اس کے ذمے دار وہ نہیں بلکہ یہ سماج ہے۔ ایسے لوگ پھر سے تندرست ہو کر بڑے بڑے تخلیقی کام کریں' یہ ایک محال امر ہے۔ مگر اس حقیقت کے باوجود بھی وہ پیڑ پودوں کی طرح جیے چلے جا رہے ہیں۔ میڈیکل سائنس اب اتنی آگے بڑھ چکی ہے کہ قریب المرگ مریض کو بھی تم برسوں تک مصنوعی نظام تنفس کے سہارے زندہ رکھ سکتے ہو۔ لیکن ایسا کرنے سے حاصل کیا ہوگا؟

اس لیے میں اپنی جان' اپنی مرضی سے' اپنے ہاتھوں لینے کو بھی ایک بنیادی انسانی حق سمجھتا ہوں کیونکہ جب یہ حق استعمال ہوتا ہے تو پھر وہ صورتحال پیدا ہونے کی نوبت ہی نہیں آتی جس کی طرف میں ابھی اشارہ کر آیا ہوں۔ لیکن انسانی حقوق کی فہرست بنانے والوں نے یہ حق فہرست کا حصہ نہیں بنایا ..... اس دنیا کو چھوڑنے کا حق ..... اپنی ٹکٹ واپس کرنے کا حق ..... یہ کہنے کا حق کہ مجھے اب اپنے گھر واپس جانا ہے' تم مجھے یا میرے جیسے کسی اور کو روکنے والے کون ہوتے ہو؟

ترقی یافتہ ملکوں میں اوسط عمر بہت بڑھ چکی ہے' ایسے میں لاچار بوڑھوں کی تعداد میں بھی بہت تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ یہاں تک کہ اکثریت کی اولاد بھی بڑھاپے میں داخل ہو گئی ہے۔ تیسری نسل کے بچے کا عمر رسیدہ بوڑھے سے کوئی ذہنی تعلق نہیں رہا۔ ایسے بوڑھے ہسپتالوں یا اولڈ ہاؤسوں میں پڑے سڑتے رہتے ہیں۔ نئی نسل کے بچوں کو ان سے ملنے کی آخر ضرورت بھی کیا ہے۔ تیسری نسل کے دل میں ان ''ٹنڈ منڈ درختوں'' کا کوئی احترام نہیں ہے۔

مہینوں پہ مہینے گزر جاتے ہیں لیکن یہ بوڑھے اپنے بستروں پر پڑے انتظار کرتے رہتے ہیں ..... کہ کوئی آئے گا' کوئی دوست' کوئی بیٹا بیٹی' کوئی نواسہ پوتا یا کوئی جان پہچان والا۔ مگر کوئی نہیں آتا۔ لوگ اُن سے گریزاں رہتے ہیں۔ مزاجاً بھی وہ اُکتا دینے والے ہو جاتے ہیں۔ اُن سے ملاقات کر کے یوں لگتا ہے جیسے تمہیں پچاس سال پرانا اخبار زبردستی پڑھنے کے لیے تھما دیا گیا ہو۔ ان کے پاس کوئی نئی بات نہیں ہوتی جو تمہیں بھائے' بات سے بات نکلے اور گفتگو چلتی جائے۔ وہ جو بھی کہتے ہیں پچاس یا ساٹھ سال پرانا ہوتا ہے۔ تم انہیں

ملنے جاؤ تو وہ اُس پُرکشش زمانے کی بات چھیڑیں گے جب وہ جوان تھے اور زندگی بہت وقت طلب ہوتی تھی' آسانیاں نام کو بھی نہ تھیں اور زندہ رہنا ایک جنگ لڑتے رہنے کے مترادف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تم چاہو بھی تو اُن سے کوئی سانجھ پیدا نہیں کر سکتے لہٰذا تم اُکتا جاتے ہو۔ گزشتہ پانچ سات دہائیوں میں سب کچھ بدل گیا ہے لیکن انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ کیا کیا بدل گیا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ تم اپنی بے پناہ مصروفیات سے ایک گھنٹہ نکال کر کسی دوسرے شہر سے بذریعہ ہوائی جہاز کسی بوڑھے سے ملنے جاؤ اور وہ چھوٹتے ہی اپنے بچپن کے اُس واقعے کا ذکر شروع کر دے جب وہ گھوڑا گاڑی کے نیچے آ کر مرتے مرتے بچا تھا۔ مختصر یہ کہ تمہارا اور اُن کا ذہنی فاصلہ بہت طویل ہے اور یہ فاصلہ نہ وہ طے کر سکتے ہیں اور نہ ہی تمہارے پاس اس دوری کو سمیٹنے کی فرصت ہے۔ تم تو اپنے زمانے کے مطابق ٹھیک ہو لیکن اُن بے بس اور مجبور بوڑھوں کی زندگی کو زندگی کہنا بھی زندگی سے مذاق ہے۔

مگر دنیا کی کوئی حکومت بھی خودکشی کے حق کو بنیادی اور پیدائشی انسانی حق نہیں مانتی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے اعلامیے میں اس حق کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

حکومتی اور سیاسی لوگ چونکہ بہت مکار ہوتے ہیں لہٰذا وہ اس موضوع پر بحث ہی نہیں کرنا چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صرف ایسی ہی باتیں دہراتے رہتے ہیں جو تم اور تم جیسے دوسرے لوگ سننا چاہتے ہیں۔ درحقیقت حالات جس تبدیلی کا تقاضا کر رہے ہوتے ہیں' اس سے ان مکاروں کو کچھ سروکار نہیں ہوتا۔ ان کا مقصد صرف اور صرف یہ ہوتا ہے کہ کھوکھلے لفظوں کے ساتھ ٹھوس وعدے اور پکی یقین دہانیاں تعمیر کی جائیں اور بعدازاں تمہیں ان پُرفریب باتوں کے سرابوں کے پیچھے بھگا دیا جائے۔ المیہ اُن کا یہ چلن نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ تم ایسا ہی کرتے ہو' یوں وہ کامیاب رہتے ہیں۔

جن بنیادی حقوق کی فہرست مرتب کی گئی ہے' میں دعوے سے کہتا ہوں کہ دنیا بھر میں کہیں بھی وہ حق نہیں دیئے جاتے نہ دیئے جائیں گے۔

میں کچھ اہم حقوق کا ذکر کروں گا۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ان انسانی حقوق کی توہین کے نتیجے میں بہت سے بے رحمانہ کام کیے گئے ہیں' جن کے باعث انسانی باطن شدید زخمی ہو کر رہ گیا ہے۔

دو باتیں ذہن نشین رکھنا۔ ایک تو یہ کہ جن لوگوں نے مذکورہ اعلامیہ جاری کیا ہے انہوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ لوگ باطنی تکلیف میں مبتلا ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ پوری انسانیت

کو ایک گہرے کرب میں مبتلا تصور کر رہے ہیں۔ لیکن میری نظر میں یہ دونوں باتیں غلط ہیں کیونکہ مجھے تو انسان کے اندر آج تک ضمیر نامی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ تو پھر کہاں کی باطنی تکلیف اور کہاں کا گہرا کرب؟

جب کوئی مسلمان کسی ہندو کو قتل کرتا ہے تو کوئی بھی مسلمان یہ نہیں سوچتا کہ ایسا کرنا قابل مذمت ہے۔ لہٰذا ضمیر کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایک ہندو کو قتل کر کے مسلمان نے اپنے مذہب کی رُو سے نہایت قابلِ تعریف کام کیا ہے۔ ہندوؤں کا بھی یہی حال ہے' عیسائی بھی اسی صورتحال کا شکار ہیں بلکہ عیسائیوں نے تو اتنے انسانوں کا خون بہایا ہے کہ یقیناً کسی دوسرے مذہب کے لوگوں نے اتنا انسانی خون کبھی نہ بہایا ہوگا اور خون بہانے کا بھی کیا مطلب! انہوں نے تو لوگوں کو زندہ ہی جلا کر راکھ کر دیا۔ دوسرے تو گردن کاٹتے ہیں' کچھ گردن کاٹ کر بھی تسلی نہ ہو تو بعدازاں لاش جلا دیتے ہیں مگر عیسائیوں کے پاس شارٹ کٹ تھا۔ وہ قتل کرنے کے بعد جلانے کی زحمت نہیں اٹھانا چاہتے تھے لہٰذا ایک جیتے جاگتے انسان کو براہِ راست جلا دیا کرتے تھے۔ کتاب ایک ہو تو خوامخواہ دو حصوں میں کیوں چھاپی جائے۔ موت ایک عمل ہے تو اسے دو طریقوں سے کیوں انجام دیا جائے کہ پہلے مارو اور پھر جلاؤ۔ لہٰذا عیسائیوں نے ہزاروں لوگوں کو براہِ راست آگ کا عذاب دے کر موت کی نیند سلا دیا۔ مجھے تو دکھائی نہیں دیتا کہ ایسے واقعات پر کہیں بھی کوئی ضمیر زخمی ہوا ہو' غور کر لیں' خراش تک نہ آئی ہوگی۔

اگر انسانی حقوق کی پامالی پر انسانی ضمیر واقعتاً زخمی ہونے لگے تو حالات خود بخود بدل جائیں گے۔ کیونکہ یہ سب کچھ کون کر رہا ہے؟ ہم خود ہی تو کر رہے ہیں!

مذکورہ اعلامیے کی تمہید بہت بھیانک دروغ گوئی پر مشتمل ہے۔ کتنی ستم ظریفی سے کہا گیا ہے۔ جنگلی کام۔ ''بہرحال یہ اک حقیقت ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں ہم نے اس قدر جنگلی کام نہیں کیے ہوں گے جتنے گزشتہ پچاس سال میں کیے ہیں۔ دس ہزار سال پہلے ہم اتنے وحشی نہ تھے جتنے بیتی چند دہائیوں میں ہو گئے ہیں۔ ہم جنگلی اور مزید جنگلی بنتے جا رہے ہیں۔'' وہ کہتے ہیں کہ ایسا انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں اور نتیجتاً انسانی باطن کو پہنچنے والے صدمے سے ہوا ہے لیکن میں نہیں مانتا۔ میرے خیال میں تو یہ سب کچھ ایک طے شدہ طریق کار کے مطابق بہت جدید انداز میں ہوا ہے۔ رہی ضمیر کی بات تو اگر ضمیر ہوتا یا انسانی [illegible] انسانوں میں ہلاکت

بانٹتا۔ پس ثابت ہوا کہ کوئی ضمیر نہیں تھا۔

ہیروشیما اور ناگاساکی کے بارے میں کیا خیال ہے' کیا یہ جنگلی کام ان دو عظیم شہروں کے خوبصورت لوگوں کو یکا یک ''جنت رسید'' کرنے کے لیے کیا گیا تھا؟ دونوں شہر اپنے دو لاکھ سے بھی زیادہ شہریوں کے ساتھ نیست و نابود کر دیئے گئے۔ صرف پانچ منٹ کے اندر زندگی کے ہنستے کھیلتے منظر موت کی بھیانک تصویریں بنا دیئے گئے۔ کیا یہ جنگلی کام امریکہ نے نہیں کیا تھا؟ تہذیب؟..... انسانی حقوق؟..... اقوام متحدہ؟..... عالمی عدالت؟

دنیا بھر کے فوجی اور جنگی ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانا عسکری حکمت عملی کے اعتبار سے غیر مفید اور بے معنی تھا۔ جاپان ہتھیار ڈالنے پر تیار تھا۔ جرمنی پہلے ہی ہتھیار ڈال چکا تھا لہٰذا اب جاپان کے جنگ جاری رکھنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ یوں بھی وہ ایک ہفتے سے زیادہ جنگ جاری رکھنے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔ جرمنی کے شکست کھانے کے بعد جاپان اکیلا جنگ جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ چھوٹا سا ملک ہے' وہاں کے لوگ جفاکش اور بہادر ہیں لیکن ملک چھوٹا سا ہے۔ وہ جرمنی کے سہارے جنگ میں شریک تھا اور جب یہ سہارا بھی نہ رہا تو وہ خود بھی شکست تسلیم کرنے ہی والا تھا۔

مگر امریکہ کے صدر ٹرومین کو یہی خدشہ تھا کہ اگر جاپان چند روز میں ہتھیار ڈال دیتا ہے تو پھر میں اپنے ایٹم بم کو چلانے کا نیا موقع کیسے پیدا کروں گا۔ انہوں نے ایٹم بم کی تیاری میں بے تحاشا رقم' بہت بڑی افرادی قوت اور بے پناہ قومی وسائل استعمال کیے تھے۔ اب وہ اپنی ایجاد کو انسانی تاریخ میں پہلی بار چلانے' آزمانے اور اس کے ''فرحت بخش'' نتائج دیکھنے کا موقع ضائع کر دیتے' یہ کیسے ممکن تھا۔

مگر آج بڑی بے شرمی سے کہا جاتا ہے کہ ان جنگلی حرکتوں کی وجہ سے انسانیت کا باطن زخمی ہو گیا۔ ذرا سوچو! امریکہ کا صدر ٹرومین کتنا مہذب آدمی تھا! اس کے فوجی مشیروں نے واضح طور پر کہا تھا کہ اب ایٹم بم کا استعمال بے مقصد ہے لیکن اس کے باوجود بھی وہ جاپان پر ایٹم بم گرا کر ہی رہا۔ کیا وہ جنگلی تھا؟

اگلے دن سینکڑوں صحافی ٹرومین سے ملنے کے لیے وائٹ ہاؤس میں اکٹھے ہو گئے کیونکہ وہ انسانی تاریخ کے بدترین واقعے کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ لیکن پہلے یہ سن لو کہ گزشتہ رات ٹرومین وائٹ ہاؤس میں جاگ رہا تھا' نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی' اُسے انسانی تاریخ کی اہم ترین خبر کا انتظار تھا اور آخرکار وہ یہ اطلاع پا کر ہی اپنے بستر پر لیٹا

تھا کہ لاکھوں جاپانی جل کر بھسم ہو گئے ہیں۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ اب دنیا کے نقشے پر عظیم الشان انسانی بستیوں کی جگہ ملبے' راکھ اور لاشوں کے وسیع وعریض اونچے نیچے انبار ہیں...... یا چند سسکتی ہوئی زندگیاں جنہیں اگر موت بھی دیکھے تو خودکشی کر لے۔ جمع ہونے والے صحافیوں نے ٹرومین سے پوچھا: "جناب صدر! کیا آپ گزشتہ رات سکون کی نیند سو سکے؟" امریکہ کے "مہذب" صدر نے جواب دیا: "ہاں میں معمول سے زیادہ گہری اور پرسکون نیند سویا کیونکہ ہمارا تجربہ کامیاب رہا۔ اب ہم دنیا کا سب سے طاقتور ملک ہیں"۔ اور تم ضمیر کی بات کرتے ہو!!

دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کے دو بڑے شہروں کے لاکھوں لوگ "جدید ترین موت" کا شکار ہو گئے اور جس آدمی کے حکم سے یہ قیامت برپا ہوئی وہ معمول سے زیادہ گہری اور پرسکون نیند سویا......اس طرح سویا کہ پہلے کبھی ایسے نہ سویا تھا۔ اگر امریکہ کے حاکم اعلیٰ ٹرومین...... جیسے آدمی کی یہ حالت ہے تو اُن لوگوں کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے جو اس قدر "سچے آدمی" نہیں ہیں۔

جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں' تہذیب ایک خواب ہے' ایک امید ہے اور ایک عوامی لائحہ عمل ہے۔ اگر ہم لفظی جادوگروں کی لفاظی میں نہ آئیں اور خود کو مہذب تصور کرنے سے باز رہیں تو یہ امید مجسم ہو سکتی ہے اور یہ سپنا ایک ٹھوس شکل اختیار کر سکتا ہے۔

رہا ضمیر' تو یہ غور و فکر سے پیدا ہوتا ہے۔ تم ضمیر کو ساتھ لیکر پیدا نہیں ہوتے۔ کبھی تم نے ننھے منے بچوں کی حرکات پر غور کیا ہے' وہ جیسے ہی چیونٹی دیکھتے ہیں اُسے فوراً مسل کر مار دیتے ہیں اور اس حرکت پر خوش بھی ہوتے ہیں۔ کیا ایسے بچے قاتل ہوتے ہیں؟ مجرم ہوتے ہیں؟ اور کیا اُن کے ضمیر پر بھی انگلی اٹھائی جا سکتی ہے؟ نہیں' یہ سوالات اصلیت تک نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ اصل بات یہ ہے کہ ننھا بچہ چیونٹی کو مارنے کا عمل ایک کھیل کی طرح انجام دیتا ہے۔ وہ دنیا کی جستجو میں ہے' وہ ایک نئی دنیا میں نووارد ہے لہٰذا اس کی جستجو کا عمل بالکل فطری ہے۔ ایسا بچہ قاتل ہے نہ مجرم اور نہ ہی ابھی وہ "ضمیر" نامی کسی اصطلاح سے آشنا ہے۔ بچہ اس بات سے بالکل بے خبر ہوتا ہے کہ چھڑی مارنے سے پالتو کتے کو درد ہوتا ہے۔ ان مثالوں سے ثابت ہوا کہ بچوں میں ضمیر نہیں ہوتا لیکن "ضمیر کا بیج" ضرور ہوتا ہے۔

عالمی سیاسی شطرنج کے رنگ برنگے مہرے تمہیں یقین دلائے جا رہے ہیں کہ تمہارے پاس ضمیر ہے۔ لیکن میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ تم ضمیر سے محروم ہو لیکن ضمیر کو [illegible] سکتے ہو کیونکہ اس کا بیج تم میں پیدائشی طور پر رکھا گیا

ہے۔ تمہیں خود اپنے لیے محنت کرنا ہوگی۔ اور پرسکون رہنے کا ہنر سیکھنا ہوگا۔

میں نہیں سمجھتا کہ جن لوگوں نے "انسانی حقوق کا مشترکہ عالمی اعلامیہ" جاری کیا ہے' انہیں ضمیر یا شعور اور فہم و فراست کا کوئی احساس ہوگا۔ کیونکہ ایسے احساس کی منزل تو بہت لمبے سفر کے بعد ہی نظر آتی ہے۔ تمہیں ماں کی کوکھ سے پیدا ہوتے ہی سب کچھ نہیں مل جاتا۔ پیدائش کے فوراً بعد تو تمہیں صرف وہی اسباب میسر آتے ہیں جو تمہارے زندہ رہنے کے لیے اشد ضروری ہیں۔ باقی ہر چیز کی تمنا تازہ بوئے ہوئے بیج کی طرح تمہارے اندر ہوتی ہے لیکن اسے پروان چڑھا کر پھل حاصل کرنا تمہاری اپنی ذمہ داری ہے۔ اگر تم شعور کو اس کی اعلیٰ ترین بلندی تک بڑھانا چاہو تو یہ صرف تمہی پر منحصر ہے۔

قدرت تمہارے لیے محض وہی ذرائع یکجا کرتی ہے جو زندہ رہنے کے لیے ناگزیر ہیں' زندہ تم نے خود رہنا ہے' قدرت تمہیں زندگی نہیں دیتی' طمانیت نہیں دیتی' پرسکون ارتکاز نہیں دیتی اور یہاں تک کہ محبت بھی نہیں دیتی۔ قدرت کا کام تو عقل اور تمنا سے بخوبی چل سکتا ہے تو پھر وہ پریم وغیرہ کے چکر میں کیوں پڑے۔ محبت تو تمہیں خود ہی تلاش کرنا ہوگی۔ شعور کو بتدریج ترقی یافتہ کرنا بھی تمہاری ہی ذمے داری ہے۔ تمہاری روح تمہارے لیے ایک باغ کی طرح ہے اور تمہارا کردار باغبان والا ہونا چاہیے۔

تمہاری باطنی روح ہی وہ باغِ عدن ہے جس کا تذکرہ بائبل میں کیا گیا ہے' باغِ عدن کسی دور دراز واقع ستارے پر قائم نہیں بلکہ تمہارے باطن میں مہک رہا ہے۔ صرف تم باہر ہو کیونکہ تم اس سے باہر نکالے گئے ہو۔ اپنے خارج میں تو تم چاروں طرف بھاگتے رہتے ہو لیکن اپنے باطن میں داخل نہیں ہوتے اور جس لمحے تم اپنے باطن میں' اپنے اندر جاتے ہو' تم عین اُسی لمحے پھر سے باغِ عدن میں داخل ہوتے ہو۔

لیکن ہمارے ہاں ہزاروں سال سے کسی نے اس حوالے سے غور و فکر ہی نہیں کیا۔ تم کبھی اپنے اندر نہیں گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر پھول' پتہ' شاخ اور تنا پھر سے اپنے بیج میں جا سمایا ہے۔ اب وہاں کچھ نہیں کھلتا' نہ پھول ہیں نہ سبزہ۔ لیکن بیج کو پھر سے اُگانا اور پروان چڑھانا اب بھی تمہارے بس میں ہے۔ کیونکہ توقع اور امید کی طرح وہ بیج بھی کبھی فنا نہیں ہوتا' موت اس کے لیے نہیں ہے۔

یہ لوگ نہیں جانتے کہ ضمیر کیا ہے۔ انہوں نے محض ایک لفظ سیکھ لیا ہے' بار بار اور غلط معنوں میں دُہرانے کے لیے تاکہ تم فریب کھا کر ان کے پھندے میں پھنس جاؤ۔

میں نے سنا ہے کہ ایک بار کوئی پڑھا لکھا جاہل ڈاکٹر کی خالی آسامی کے لیے زبانی انٹرویو دے رہا تھا۔ تین پروفیسر سوالات کرنے کو موجود تھے۔ انہوں نے باہم مشورے سے پہلا ہی سوال یہ پوچھا کہ ''انسانی ماں کے دودھ کی تین اعلیٰ ترین خوبیاں بیان کرو۔'' اب امیدوار بیچارہ پریشان ہوگیا۔ چند لمحے تو خاموش رہا لیکن جواب دیئے بغیر بھی چارہ نہ تھا لہٰذا بولا: پہلی بات تو یہ کہ بچے کی پرورش کے لیے جو ضروری غذائی عناصر مطلوب ہوتے ہیں وہ ماں کے دودھ میں قدرتی طور پر پائے جاتے ہیں اور یوں یہ ایک مکمل غذا ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ چونکہ یہ ماں کے جسم کے اندر سے آتا ہے لہٰذا حرارت آمیز ہونے کے باعث زود ہضم ہوتا ہے' ماں کے جسم کے اندر سے آنے کے باعث ملاوٹ کا بھی خدشہ نہیں رہتا اور نہ ہی اس دودھ میں جراثیم ہوتے ہیں۔

انٹرویو لینے والے فاضل امیدوار کی ذہنی سطح کو تو خیر انہی باتوں سے جان گئے لیکن جب یہ باتیں کر کے وہ خاموش ہوگیا تو ممتحن بولے: ''یہاں تک تو ہم مان لیتے ہیں کہ آپ نے ٹھیک کہا ہے لیکن یہ تو صرف دو خوبیاں ہوئیں باقی باتیں تو آپ نے انہی دو خوبیوں سے متعلقہ بیان کی ہیں' ہمارے سوال کی رُو سے ایک خوبی آپ نے مزید بیان کرنی ہے۔ ذرا بتایئے تو' وہ کون سی ہے؟''

اس پر وہ آدمی کچھ دیر کو چپ ہو رہا کیونکہ انسانی ماں کے دودھ کی دو اعلیٰ ترین من گھڑت خوبیاں تو وہ بیان کر چکا تھا مگر تیسری نہیں سوجھ رہی تھی۔ تیسری خوبی کے طور پر ایک بات اس کے ذہن میں موجود تھی لیکن وہ ہچکچا رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اس کے علاوہ کچھ یاد آ جائے تو بہتر ہے مگر جب ذہن پر بہت زور دیئے پر بھی تیسری خوبی نہ سوجھی تو اُس نے کہہ ہی دیا: ''اور تیسری یہ کہ یہ دودھ خوبصورت برتنوں سے پھُوٹتا ہے۔''

غور کرو' وہ کیسا احمق تھا جو ڈاکٹر بننے جا رہا تھا۔ اس کے فہم و تدبر کا بھی اندازہ لگاؤ کہ بہت غور و خوض کے بعد جو بات اُس کے ذہن میں آئی وہ کیا تھی: ''خوبصورت برتنوں سے پھوٹتا ہے۔'' ان الفاظ سے اس کی ذہنی سطح کا خوب اندازہ ہوسکتا ہے۔ اسی قسم کے لوگوں نے بنیادی انسانی حقوق کا مشترکہ بین الاقوامی اعلان نامہ جاری کیا ہے۔ آؤ اب اس اعلامیے کے ڈھول کا پول کھولیں اور دیکھیں کہ خوبصورت لفظوں کے انبار کی حقیقت کیا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ میں چند اعتراضات پر ہی اکتفا کروں گا' اور ان کی روشنی میں ہی تم جان جاؤ گے کہ باقی پورے اعلامیے کی کیا حیثیت ہے۔

انجمن اقوام متحدہ کی طرف سے جاری کردہ ''بنیادی انسانی حقوق کے مشترکہ عالمی اعلان نامے کی پہلی شق میں کہا گیا ہے کہ تمام انسان پیدائشی طور پر آزاد ہیں۔

یہ بالکل بکواس ہے۔ اگر تمام انسان پیدائشی طور پر آزاد ہیں تو انسانی بچے کو آزاد چھوڑ دو' چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر نہ مر جائے تو کہنا۔ ہماری دنیا میں انسانی بچے کو سہاروں کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے' ایسے میں اُس کے پاس کیا آزادی ہوسکتی ہے؟ وہ بول نہیں سکتا' چل نہیں سکتا' اٹھ نہیں سکتا' خود بخود کھا پی نہیں سکتا۔

سچ تو یہ ہے کہ ابھی میں تمہیں ایک عالم کا قول سنانے والا ہوں اور مجھے اس قول سے ہمدردی ہے کہ ''انسان کا بچہ اپنے وقت سے پہلے ہی پیدا ہو جاتا ہے۔ اُسے کم از کم مجموعی طور پر اٹھارہ مہینے ماں کے پیٹ میں رہنا چاہیئے' کیونکہ ابھی وہ پورا نہیں ہوتا' ادھورا ہوتا ہے اور ابتدائی ارتقاء کے مزید مرحلے طے کر رہا ہوتا ہے۔'' تم نے جانوروں کے بچے دیکھے ہیں' وہ پیدا ہوتے ہی چلنے پھرنے لگتے ہیں کیونکہ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو کر پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنی خوراک بھی پیدا ہونے کے فوراً بعد خود تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انسانی بچے کی نسبت زیادہ خود انحصار ہو چکے ہوتے ہیں۔ جہاں تک انسانی بچے کی بات ہے تو وہ ماں باپ' خاندان یا دیگر لوگوں کے سہارے کے بغیر اپنی بقا کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ غور کرو! اس کی کیا آزادی ہوسکتی ہے؟ اور یہ کہتے ہیں کہ تمام انسان پیدائشی طور پر آزاد ہیں۔

اسی لیے میں بار بار زور دے کر کہتا ہوں کہ انسانی حقوق کی خوبصورت اصطلاح کی آڑ میں جاری تمام ترقبیح اور غیر انسانی سرگرمیاں عالمی سیاست کے کچھ گندے دماغوں کی کارستانی ہیں۔ وہ لوگ تمہیں ایک خوبصورت خیالی مجسمہ تراش دیتے ہیں اور تم اُس مجسمے کے بھگت بن کر آنکھیں بند کیے وہ سارے منتر انتہائی عقیدت سے الاپتے رہتے ہو جو وہ سننا چاہتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ آزادی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آزادی کی خواہش نہ کرو' تم آزاد پیدا ہوئے ہو' جس طرح تم جیسے دوسرے لوگ آزاد پیدا ہوتے ہیں۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ تمام انسان مجبور اور محتاج پیدا ہوتے ہیں جنہیں ''آزاد'' ہونے کے لیے برسوں کی محنت درکار ہوتی ہے۔ اور اس کے باوجود بھی کروڑوں لوگ تمام عمر ''آزاد'' نہیں ہو پاتے۔ اگرچہ عالمی اعلامیے کے مطابق سبھی انسان پیدائشی طور پر آزاد ہونے کا اعزاز رکھتے ہیں مگر لاتعداد لوگ اپنی زندگی کی آخری سانس تک مجبور اور محتاج ہی رہتے ہیں ..... روزِ اوّل کی طرح۔ تم مجبور ہو یا آزاد؟ یہ جاننے کے لیے زیادہ تگ و دو کرنے کی ضرورت نہیں' اپنی مختصر سی زندگی کا جائزہ لو' حقیقت خود ہی آشکار ہو جائے گی۔

آخر تم کس آزادی کی بات کرتے ہو؟ جو میاں کی وجہ سے بیوی اور بیوی کے باعث میاں کو حاصل نہیں ہو پاتی۔ میں نے شادی شدہ جوڑوں کو فٹ پاتھوں پر ایک ساتھ چلتے بغور دیکھا ہے۔ خاوند کو اِدھر اُدھر نظر آزمائی کرنے کی ہرگز آزادی نہیں ہوتی۔ وہ ایک بدھ بھکشو کی طرح ناک کی سیدھ میں چلتا ہے اور نگاہیں سامنے راستے پر مرکوز رکھتا ہے.... وہ چار فٹ سے آگے دیکھنے کی ہمت کبھی نہیں کرتا کیونکہ بیوی ترچھی نظروں سے مسلسل ''چیک اینڈ بیلنس'' رکھتی ہے۔ دوسری طرف بے چاری بیویوں کے ساتھ بھی ایسا ہی مالکانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ اگر تم پیدائشی طور پر آزاد ہو تو یہ آزادی کی کونسی قسم ہے کہ مرد کے گھر میں داخل ہوتے ہی عدالت لگ جائے اور پوچھا جائے ''اب تک آپ کہاں تھے' اتنی دیر کیوں کی' جلدی گھر آنے میں آخر قباحت ہی کیا ہے؟؟؟'' دیتے رہو جواب' بولتے رہو جھوٹ پر جھوٹ اور پھر جھوٹ چھپانے کے لیے مزید جھوٹ ... کیونکہ تم پیدائشی طور پر آزاد ہو۔ یہ میں نہیں کہتا 'وہ کہتے ہیں۔

میں جب سکول میں زیرِتعلیم تھا تو اکثر دیر سے گھر آتا تھا۔ کبھی گھر سے سکول پہنچنے میں بھی تاخیر ہو جاتی تھی' کیونکہ گھر اور سکول کے درمیان زندگی بہت خوبصورت تھی۔ میرے سکول کے اردگرد آموں کے بہت سے درخت تھے' شاخوں پر پھل آنے کے دن آتے تو ان درختوں کے پاس سے گزرنا بھی ... کیا بیان کروں' یوں لگتا تھا جیسے گردوپیش کی مہکی ہوئی ہوا آموں سے زیادہ میٹھی ہو گئی ہو۔ درخت تو اور بھی تھے لیکن اُس درخت کا کیا کہنا جس کی شاخوں پر پھلوں کا بادشاہ حکمرانی کرتا ہے۔ اس موسم میں مجھے کلاس روم کی بجائے آم کے درخت پر چڑھ بیٹھنا زیادہ بھاتا تھا۔

پہلی دفعہ جب میں مڈل سکول میں آدھا گھنٹہ تاخیر سے پہنچا تو استاد نے تنبیہی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا: ''یہ نہیں چلے گا۔ کم از کم میرے ساتھ تو ایسے نہیں چلے گا۔ اگر

تمہیں میرے مضمون کی پڑھائی مطلوب ہے تو کلاس میں میری آمد سے پانچ منٹ پہلے پہنچنا ہوگا۔ تم دیر سے کیوں آئے ہو؟ کیا کرتے رہے ہو راستے میں؟..... خیر' جو ہوا سو ہوا لیکن آئندہ تمہیں وقت کی پابندی کرنا ہوگی۔''

جواباً میں نے کہا: ''سنیے' آپ کی اس تنبیہی اور استفساری گفتگو کے بعد میں نے مستقبل میں شادی نہ کرنے کا اٹل فیصلہ کرلیا ہے۔'' وہ انتہائی حیران ہوئے اور بولے: ''کیا؟ میری اس گفتگو کا شادی سے کیا تعلق؟''

اور تم جو اس وقت میری گفتگو سن رہے ہو' میرے استاد ہی کی طرح حیران ہو' لیکن میں تمہیں سمجھاتا ہوں کہ میں نے ایسا کیوں کہا تھا۔ میں اپنے گلی محلے کے گھروں میں ایسی ہی ناخوشگوار بحثیں سنتا چلا آیا تھا۔ لگ بھگ سبھی بیویاں چھوٹتے ہی خاوند سے پوچھتی تھیں ''آپ اب تک کہاں تھے وغیرہ وغیرہ'' یوں میں نے طے کرلیا کہ میں اس قبیل کے سوالات کے جواب ہرگز نہ دوں گا۔ اسی باعث میں نے اپنی ازدواجی زندگی شروع کرنے سے قبل ہی اسے اپنی ذاتی آزادی پر قربان کر دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے استاد سے کہا تھا: ''محض آپ کے تنبیہی استفسار ہی کی وجہ سے میں نے ہمیشہ غیرشادی شدہ رہنے جیسا غیرمعمولی فیصلہ کرلیا ہے لہٰذا یہ توقع نہ رکھیں کہ میں آپ کے کسی بھی سوال کا جواب دوں گا۔ میں جواب دہی کے اس عمل میں پھنسنے کی بجائے وہ مضمون ہی بدل لوں گا جو آپ پڑھاتے ہیں..... نمستے۔'' وہ حیرت زدہ کھڑے تھے' کلاس سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: ''یہ لڑکا بہت عجیب ہے' شادی کا میرے مضمون سے کیا تعلق؟ شادی' جغرافیہ' سوال...... عجیب لڑکا ہے۔''

وہ میرے بارے میں بہت متجسس ہو گئے تھے۔ چھٹی کے بعد انہوں نے مجھے بلا لیا اور پوچھا: ''اب ہم کھل کر بات کر سکتے ہیں نا؟ میں سمجھنا چاہتا ہوں' جو کچھ تم نے کلاس میں کہا۔ آخر بات کیا ہے؟ کیوں ایسا ہوا؟'' میں بولا: ''کسی کو بھی یہ پوچھنے کا حق نہیں ہے کہ میں کہاں تھا' کیا کر رہا تھا اور مجھے فلاں سے فلاں مقام تک پہنچنے میں تاخیر کیوں ہوئی۔ میری زندگی صرف میری زندگی ہے۔ اگر میں اسے بے فائدہ ہی گنوانے پر آمادہ ہو جاؤں تو یہ بھی میرا حق ہے' بالکل اُسی طرح' جیسے کسی دوسرے کو اپنی زندگی اپنی مرضی سے بچانے کا حق حاصل ہے۔ آپ محض ایک ملازم ہیں اور آپ کو صرف جغرافیہ پڑھانے پر مامور کیا گیا ہے۔ لہٰذا ذاتی سوال پوچھنا آپ کا منصب ہے نہ حق۔ نہ ہی میں ایسے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند ہوں جو میری ذاتی آزادی میں خلل انداز ہو سکتا ہو۔ مجھے اس قسم کے سوال بالکل پسند

نہیں؛ میں یہ سکول چھوڑ سکتا ہوں؛ یہاں تک کہ تعلیم کا خیال ہی دل سے نکال دوں گا۔ کیونکہ میری نظر میں ویسے بھی یہ سب غیر ضروری ہے۔ اس حوالے سے انسانی تاریخ کی اہم ہستیوں کی مثالیں موجود ہیں: یسوع (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کون سے سکول میں پڑھے تھے؟ روحانی یکسوئی اور ارتکازِ توجہ جیسے ذاتی اوصاف انہوں نے کس ادارے سے سیکھے تھے؟ کیا کبیر نے بغیر تعلیم حاصل کیے دھرم کی سچائی کو نہیں پایا...... مجھے کاروبار، ملازمت یا کسی دوسری معاشی مصروفیت سے ذرا بھر بھی لگاؤ نہیں ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی کلاس میں رہوں تو آپ کو بطور انسان خود کو مزید ترقی دینا ہوگی۔ ازراہِ کرم، میری آزادی میں یوں ہر وقت دخل اندازی نہ کیجئے گا۔" اور استاد صاحب خاموش ہو گئے۔

کچھ ہی دیر پہلے میں تمہیں بتا رہا تھا کہ مغربی منافقوں کے اعلامیے کی پہلی شق کہتی ہے کہ تمام انسان پیدائشی طور پر آزاد ہوتے ہیں۔

یاد رکھو! یہ سب انسانیت کو روایات میں قید رکھنے کے ہتھکنڈے ہیں۔ وہ صرف تمہارے ذہن میں یہ خیال پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ تم آزاد ہو، لہٰذا اب آزادی کے لیے جدوجہد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور باطنی دنیا کی تسخیر لایعنی ہے۔ حالانکہ اپنے باطن پر فتح پا کر ہی تم حقیقی آزادی کی مسرت سے بہرہ ور ہو سکتے ہو۔ حقیقی آزادی کی مملکت میں تم حقیقتاً آزاد ہوتے ہو...... ہر چیز سے آزاد...... جسم سے بھی آزاد...... کیونکہ جسم بھی تو ایک بندھن ہے۔

مشرق، مغرب کی نسبت کہیں زیادہ ایماندار ہے۔ مشرقی افکار کے مرکزی دھارے کی تعلیمات کہتی ہیں کہ تم ایک بندھن میں پیدا ہوئے ہو، تم ہرگز پیدائشی طور پر آزاد نہیں ہو، تمہارا جسم ایک قید خانہ ہے، تمہارا دل اور دماغ بھی دو زندانوں کی طرح ہیں، تمہارا شعور بہت چھوٹے سے حلقے میں اسیر ہے لیکن یہ شعور اتنی طاقت ضرور رکھتا ہے کہ پوری کائنات کو محیط ہو جائے۔ مگر تمہیں اپنی طاقت کا اندازہ نہیں ہے کیونکہ تم یوں سوچتے ہو کہ ہم جو ہیں صرف وہی ہیں۔

اہلِ مغرب میری نظر میں انسانیت کے مجرم ہیں۔ یہ اُن لوگوں سے بھی بڑے مجرم ہیں جو پھانسی کے پھندوں کے حقدار ٹھہرتے ہیں کیونکہ یہ پوری انسانیت کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ دھوکے بازی کا یہ عمل بڑی مہارت، چالاکی اور مکاری سے انجام دیا جاتا ہے...... "تم پیدائشی طور پر آزاد ہو۔" ...... اگر یہ کہنا درست ہے تو پھر آزادی پر مزید بحث کی تو گنجائش ہی نہیں رہتی۔ ایسے میں غیر مفید اور مصنوعی اصطلاحوں کی ایجادکاری کے طویل عمل کا کیا جواز ہے،

بڑی بڑی قوموں کے بڑے بڑے اجلاس کیوں؟ پھر تو یہ سوال بھی نہیں اٹھتا کہ خود کو آزادی کے لائق بنایا جائے...... کیوں؟ کہ تم آزاد ہو۔

تاریخ میں ایک ہی آدمی ایسا نظر آتا ہے جس نے یہ پُرمغز بات کہی کہ: "تمہارے پاس روح نہیں ہے۔" اور وہ تھا جارج گرجیئیف۔ اس کے برعکس تمام مذاہبِ عالم تقریباً متفق ہیں کہ روح تمہارے اندر موجود ہے اور تم اُسے لے کر پیدا ہوئے ہو۔ مگر تاریخِ عالم کے تمام تر نظریاتی شوروغل میں صرف جارج ہی کی واحد آواز گونجی کہ تمام انسانوں میں روح نہیں ہوتی۔ انسانی باطن میں روح کی نشست گاہ خالی ہوتی ہے۔ ہاں، یہ امید اور توقع ناپید نہیں ہوتی کہ تم محنت کر کے روح کے حصول میں کامیاب ہو سکتے ہو۔ روح کی نشست کا جو چبوترہ تمہارے من میں ویران پڑا ہے، تم روح کو پا کر اُسے آباد کر سکتے ہو۔ تم اس لائق ہو کہ روح کو بنا سکو، لیکن تم اِسے حاصل کر کے پیدا نہیں ہوئے ہو۔

یہ بات میں بھی جانتا ہوں، اور جارج بھی اس سے آگاہ تھا کہ تم روح کے ساتھ ہی پیدا ہوتے ہو لیکن اس عقیدے کی بزرگی کے آگے سرِتسلیم خم کر دینے سے ہمیں کچھ نہیں ملا، ہم بدستور تہی دامن ہیں، خالی ہاتھ ہیں اور اگر یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ روحانی طور پر مفلس ہیں۔ کیونکہ روح کے ساتھ پیدا ہونے کے خیال نے ہمیں بے عمل بلکہ مدہوش کر دیا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ آتما (روح) تمہارے اندر ہے، تمہارا باطن پرماتما (روحِ اولیٰ) کا مسکن ہے اور ایشور (قادرِ مطلق) تمہارے من میں فرمانروائی کر رہا ہے...... تو پھر اب تمہیں مزید کیا کرنا ہے؟ اور کیا چاہتے ہو تم؟ اگر یہی سچائی ہے تو پھر تم اُن چیزوں کے لیے تگ و دو کرو جو تمہیں حاصل نہیں ہیں مثلاً دولت ہے، قوت ہے، دنیاوی جاہ و جلال اور عزت و احترام وغیرہ ہیں۔ کیونکہ کوئی بھی یہ تو نہیں کہتا کہ ہر بچہ ارب پتی اور صاحبِ ثروت بن کر پیدا ہوتا ہے۔ ایسا کہنے کی غلطی کوئی کرے گا بھی نہیں؛ کیونکہ یہ چیزیں مسلسل جدوجہد سے حاصل کرنی پڑتی ہیں۔

آزادی، شعور، روح، روحِ اولیٰ، قادرِ مطلق...... جو نام بھی تم چاہو پسند کر لو مگر باطنی بیداری اور ترقی ورثے میں نہیں ملتی کیونکہ یہ کوئی آبائی ملکیت یا خصوصیت نہیں ہے۔ اسے پانا پڑتا ہے اور اس عمل میں شدید ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ حقیقت تمہارے باطن کے پاتال میں گہری نیند سو رہی ہوتی ہے، یہ اصلیت تمہاری ذات کے اندھے غار میں روپوش ہوتی ہے اور یہ صلاحیت ایک امکان کی صورت تم میں کہیں نہ کہیں موجود ہوتی ہے...... مگر اسے بیدار کرنا پڑتا ہے، تلاش کرنا پڑتا ہے اور یہ سب جستجو ہی سے ممکن ہو پاتا ہے۔ تمہیں اس صلاحیت کا

سراغ لگا کر اسے پختہ کرنا چاہیے۔ یہ ایک خزاں رسیدہ شاخ کی مانند ہوتی ہے اور تمہیں اسے پھر سے سرسبز کرنا ہوتا ہے ___ مزید سرسبز اور پھولوں سے بھرپور۔

لیکن جو لوگ ہاتھ پیر ہلائے بغیر اس قسم کے شوشے چھوڑتے ہیں کہ تم انسانی احترام اور حقوق کے حوالے سے برابر ہو وہ خوبصورت لفظوں کی آڑ میں بدصورت جھوٹ بولتے ہیں۔ وہ اچھے لفظوں میں بری باتیں کر کے زبانوں کے معنوی قتل عام کے مرتکب ہوتے ہیں۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ تم میں جسمانی 'قلبی' دماغی اور وصفی حوالے سے کوئی مساوات نہیں ہے۔ ایک کا عزم' امنگ اور تمنا دوسرے سے مختلف ہے' کیسی برابری اور کون سی یکسانیت؟ سگمنڈ فرائیڈ' سگمنڈ فرائیڈ ہے' برٹرینڈ رسل' برٹرینڈ رسل ہے اور ڈی۔ایچ لارنس' ڈی۔ایچ لارنس ہے۔ دوسرا ڈی۔ایچ لارنس کبھی پیدا نہیں ہوا اور نہ کبھی ہوگا۔ ہر انسان یکتا و یگانہ ہے۔ انسانی مساوات ایک بھدا نظریہ ہے لیکن عصرِ حاضر کے انسان نے اسے لگ بھگ مذہبی عقیدہ بنالیا ہے۔

میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ ''انسانی مساوات'' ایک مہلک عقیدے کا نام ہے جو بدقسمتی سے انسانی ذہنوں میں ڈیرے ڈال چکا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ تمہیں تمہاری انفرادیت اور یکتائی یاد دلائی جائے۔

''تمام انسان عقل وضمیر جیسے اوصاف سے متصف ہوتے ہیں اور انہیں باہمی بھائی چارے کا قیام عمل میں لانا چاہیے۔'' ایسی باتیں کھوکھلے دعوؤں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں لہٰذا انسانی بہبود کی اعلیٰ ترین منزل تک رسائی کے لیے اس نوعیت کی ٹوٹی پھوٹی بیساکھیاں مستحکم سہاروں کا نعم البدل ثابت نہیں ہوسکتیں۔ میرے خیال میں تو تمام انسانوں کے پاس عقل نہیں ہوتی اور نہ ہی ہر کوئی صاحبِ ضمیر کہلانے کا مستحق ہے۔

عقل وضمیر جیسے اوصاف سے متصف انسانوں کو تلاش کیا جائے تو بہت کم مثالیں موجود ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے برٹرینڈ رسل کا ذکر کیا تھا' اسے صاحبِ عقل اور باضمیر کہا جا سکتا ہے اور رسل جیسے دیگر لوگوں کے لیے بھی ایسا کہنا روا ہے لیکن کروڑوں عام انسان تو بہت سے اپاہج عقیدوں کی معیت میں زندگی کا سفر طے کر رہے ہیں۔ جب تک تم ان غیر عقلی اور اندھے عقائد سے دستبردار نہیں ہو جاتے' تب تک تمہیں صاحبِ عقل یا باضمیر کہلانے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ عقل کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ ہندو گائے کو ''ماں'' کہتے ہیں۔ کیا یہی ''عقل'' ہے۔

ایک بار مجھے ایک نامی گرامی پنڈت سے گفتگو کا موقع ملا۔ وہ ہندوؤں کے پوپ کا درجہ رکھتا تھا۔ میں نے اُس سے استفسار کیا: ''کیا آپ کو پورا یقین ہے کہ گائے آپ کی ماں ہے؟ وہ بولا: ''کیا مطلب؟''

میں نے کہا: ''تھوڑی دیر قبل مندر میں داخل ہوتے وقت میں نے آپ کی ماں سے ملاقات کی تھی۔ وہ عورت ہے یا گائے؟''

''ظاہر ہے' مجھے جنم دینے والی ماں عورت ہے لیکن گئوماتا کو آپ کیوں بیچ میں لا رہے ہیں؟'' پنڈت سٹپٹا کر بولا۔

میں نے پوچھا: ''ایک جنم دینے والی ماں؟ ایک گئوماتا؟ کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ دونوں میں سے سگی ماں کسے سمجھتے ہیں؟''

پنڈت جی بولے: ''آپ کیسی فضول باتیں پوچھ رہے ہیں۔ ظاہر ہے آپ سے ملنے والی عورت مجھے جنم دینے والی ماں ہے اور گائے میری روحانی ماں ہے۔''

''باپ رے!'' میں نے کہا: ''پھر بیل کا کیا ہوگا؟ بیل سے بھی تو آپ کا کوئی رشتہ ہونا چاہیے یا نہیں؟ وہ کیا ٹھہرے؟ آپ کے روحانی والد ماجد یا کچھ اور؟ اور آپ خود کیا ہیں؟ ایک روحانی بیل ہیں نا..... یا پھر آپ کی نس بندی کر دی گئی ہے اور آپ پورے روحانی بیل بھی نہیں رہے ہیں؟''

تم اندھے عقیدوں کو بیمار بچوں کی طرح چھاتی سے چمٹائے ہوئے جی رہے ہو اور باتیں عقل وضمیر کی کرتے ہو؟

جن لوگوں نے انسانی حقوق کا اعلامیہ جاری کیا ہے' ان میں 90 فیصد عیسائی ہیں اور وہ جملہ مسیحی تعلیمات پر ایمان رکھتے ہیں مگر دانشور ہونے کے دعویدار بھی ہیں۔ لیکن کوئی ان عیسائی دانشوروں سے نہیں پوچھتا کہ کہاں ہے تمہاری عقلیت؟ خصوصاً مذہب کے معاملے میں یہ دانش اور ضمیر کہاں غائب ہو جاتا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ اس سوال کا اُن کے پاس کوئی تسلی بخش جواب نہیں ہے۔ چند بنیادی عقائد ہیں جن پر عیسائی مقلدین کی فکری عمارت استوار ہے۔ منطقی تجزیے اور دلیلوں کی بنیاد پر ایک عیسائی کے ذہن سے چند باتیں نکال دی جائیں تو تم حیران رہ جاؤ گے کہ باقی کیا رہ گیا ہے؟ ایسی صورت میں ایک مسیحی کا مذہب مذہبیت سے بالکل خالی دکھائی دے گا۔

لیکن بدھ دھرم میں سے آپ کچھ بھی مسترد نہیں کر سکتے کیونکہ وہاں اندھے عقائد

کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ بدھ نے خود ہی وہ سب کچھ مسترد کردیا تھا جو اندھی تقلید کی بدبو پیدا کرسکتا تھا۔ اسی لیے بدھ دھرم محض عقلیت اور خالص دلیل ہے۔

میرے خیال میں تو یہ کہنا کہ ''ہر انسان کے پاس پیدائشی طور پر عقل ہوتی ہے'' ایک ناقابل معافی جرم ہے...... ایک ایسا جرم جو انسانیت کے خلاف کیا جاتا رہا ہے اور اب بھی کیا جارہا ہے۔ دنیا کو ایک نظر دیکھنے سے یہ لگتا تو نہیں ہے کہ یہ ایک عقل مند دنیا ہے۔ یاد رکھو! ہم عقل کے سہارے نہیں بلکہ لاتعداد نادانیوں کے سہارے جی رہے ہیں۔

لیکن یہ الفاظ بہت خوبصورت اور دلکش معلوم ہوتے ہیں' ان پر بلاسوچے سمجھے ایمان لانے کو جی چاہتا ہے کہ تم عقل کے زیور سے آراستہ ہو اور ضمیر کی دولت سے مالا مال ہو وغیرہ۔ یاد رکھو! تم جتنے نادان ہوگئے اتنی ہی عجلت سے اور اتنا ہی زیادہ اعتماد کرو گے...... بے معنی لفظوں پر یہ اندھا اعتماد ختم کردو کیونکہ یہ تمہارے لیے مہلک ہے۔

وہ جسے خداداد ضمیر کہتے ہیں' میرے نزدیک اُسے پیدا کرنے کا واحد طریقہ غور وفکر ہے۔ ضمیر کسی غیرارضی خوبی یا صلاحیت کا نام نہیں بلکہ یہ غور وفکر کے بارآور ہونے کا نام ہے۔ انسانیت کے جنم سے آج تک بہت کم لوگ باشعور ہو پائے ہیں' یہی وہ لوگ تھے جو صاحبِ ضمیر کہلانے کے حقدار ہیں اور ان کی تعداد تمہاری انگلیوں کی پوروں سے زیادہ نہیں ہے۔ شعور اور ضمیر...... دونوں الفاظ ایک ہی مفہوم کے حامل ہیں۔ لیکن مذہبی لوگوں کی متنوع تشریحات کے باعث فرانسیسی کے علاوہ دیگر تمام زبانوں میں ان دونوں الفاظ کے بہت سے مفاہیم پیدا ہوگئے ہیں جو ثانوی درجے کے ہیں۔ فرانسیسی ہی وہ واحد زبان ہے جس میں شعور اور ضمیر دونوں کے لیے ایک ہی لفظ مستعمل ہے کیونکہ مذکورہ الفاظ بالکل ہم معنی ہیں۔

لیکن مذاہبِ عالم کے ٹھیکیداروں نے شعور اور ضمیر کو دو مختلف اصطلاحوں کی صورت میں الگ الگ کردیا ہے۔ ایسا کیوں کیا گیا؟ اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے۔

شعور غور وفکر کے نتیجے میں پیدا ہوکر رفتہ رفتہ پختگی حاصل کرتا ہے' یہ حقیقت ہے اور یہی حقیقت وہ تمہاری آنکھوں سے اوجھل رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن کوئی اُن مکاروں سے نہیں پوچھتا کہ تم انسانوں کو کب تک اپنی پُرفریب چالوں میں گرفتار رکھو گے۔

غور وفکر کے نتیجے میں شعور کی رونمائی کی مثال بالکل اُسی طرح ہے' جیسے تم ایک اندھیرے سے بھرے کمرے میں چراغ لے کر جاؤ تو تاریکی کی کوکھ سے اُجالا پیدا ہوجاتا ہے۔ اسی طرح جونہی تم غور وفکر کی کیفیت عالیہ حاصل کرتے ہو' اُسی لمحے تمہارے باطن میں

شعور کی رونمائی شروع ہوتی ہے اور تم دانش سے معمور ہوجاتے ہو۔

جیسا کہ میں پہلے اشارہ کرچکا ہوں' ضمیر بھی ایک خود وضع کردہ اصطلاح ہے۔ عام تصور کے مطابق ضمیر ان تمام باتوں سے تشکیل پاتا ہے جو تمہارے مذہبی رہنما' دینی ادارے اور مختلف مذاہب تمہیں سکھاتے ہیں۔ نیکی کیا ہے اور بدی کا کیا تصور ہے؟ رحم دلی کسے کہتے ہیں اور ظلم کا کیا معیار ہے؟ اس طرح کی جملہ تعلیمات کے نتیجے میں تمہارے اندر ضمیر تشکیل پاتا ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ ضمیر کو شعور سے الگ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ایسا کرنا محض چالبازی ہے۔ شعور کے بغیر ضمیر کا تصور بھی محال ہے لیکن انہوں نے تمہیں ایک مصنوعی ضمیر بنا دیا ہے تاکہ تم اس کی صدائے جرس پر لبیک کہتے رہو۔

یہاں میں اپنے ہی حوالے سے ایک مثال دینا چاہوں گا۔ میں ایک قدیم ترین مذہب کے ماننے والوں میں پیدا ہوا ہوں۔ مقلدین کی تعداد کے حوالے سے یہ ایک چھوٹا سا مذہب ہے مگر اس کے پیروکار بھی بہت سے اپاہج عقائد کے سہارے زندہ ہیں۔

اٹھارہ سال کی عمر تک میں نے اپنے گھر میں کبھی ٹماٹر نہ دیکھا تھا۔ یہ خیال نہ کرنا کہ میرے اہل خانہ کے نزدیک ٹماٹر کوئی انتہائی خطرناک چیز تھی بلکہ بات صرف اتنی سی تھی کہ ٹماٹر کی رنگت بھی ماس (گوشت) جیسی ہوتی ہے اور میرے آبائی مذہب کی رُو سے گوشت کھانا مکروہ عمل تھا۔ میں بیس سال کا ہونے کو تھا لیکن اب تک کبھی شام کے بعد کھانا نہیں کھا سکا تھا کیونکہ میرے گھر والوں کے مذہب میں اس کی سخت ممانعت ہے۔ اُن کے عقائد کے مطابق طلوع آفتاب کے بعد اور غروب آفتاب سے پہلے ہی کھایا پیا جاسکتا ہے۔ بعد از شام خورد ونوش کی ممانعت کے پیچھے یہ سوچ کارفرما ہے کہ ایسا کرنے سے کوئی کیڑا مکوڑا یا دیگر ننھا منا جاندار وجود تمہارے پیٹ میں پہنچ کر ہلاک ہوسکتا ہے۔ ایسا ہونا جیو ہتیا (جاندار کی ہلاکت) کے زمرے میں آتا ہے جو تشدد اور سخت گناہ خیال کیا جاتا ہے۔ اُن کے نزدیک اچھی طرح اجالا ہونے پر ہی کھانا پینا مستحسن ہے۔

جن دنوں میں اپنی عمر کی اٹھارہ بہاریں گزار چکا تھا' اُنہی ایام کا واقعہ ہے کہ میرے کچھ احباب نے ایک خوبصورت قلعے کی سیر کا قصد کیا جو زیادہ دور نہ تھا۔ چند میل کے فاصلے پر واقع یہ قدیم قلعہ دیکھنے کے لیے میں بھی ان کے ساتھ گیا۔ یہاں جو کچھ وقوع پذیر ہوا وہ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا اور نہ میں نے اب تک کبھی اس حوالے سے غور ہی کیا تھا۔ قلعہ کافی بلندی پر تعمیر کیا گیا تھا۔ چڑھائی چڑھنے کا عمل جاری رہا آخر میں قلعے تک پہنچے اور

گھومنے پھرنے لگے۔ قلعہ واقعی بے حد خوبصورت تھا' قدیم طرز تعمیر کی جاذبیت اور دلکشی نے سب کو اس قدر متوجہ کرلیا کہ کسی کو کھانا پکانے کا خیال تک نہ آیا۔

سب سے پہلے میں نے ہی ان کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی: ''جلدی کرو' کچھ ہی دیر بعد سورج غروب ہونے والا ہے اور مجھے سخت بھوک لگی ہے۔ یقیناً تم بھی بھوکے ہو۔ تمام دن ہم نے قلعے کی پہاڑی پر گھومتے پھرتے ضائع کردیا ہے اگرچہ یہ ایک دلچسپ اور عمدہ سیر تھی۔''

وہ کہنے لگے: ''جب تک سورج کی روشنی موجود ہے تب تک ہم اس جاہ و جلال والی عمارت کی سیر جاری رکھیں گے' ویسے بھی ابھی قلعے کے بہت سے حصے ہم نہیں دیکھ سکے۔ کھانے کا کیا ہے' بعد میں کھالیں گے۔''

اُن تمام دوستوں میں صرف ایک میں ہی تھا جو شام گہری ہونے کے بعد کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔ وہ سب تو رات کو کھانا کھانے کے عادی تھے لہٰذا انہیں سورج کے غروب ہونے اور کھانا تیار نہ ہونے پر کوئی پریشانی نہ تھی۔ رہا میں' تو انہوں نے میری بات سنی ان سنی کردی۔ میں نے بار بار انہیں کھانا تیار کرنے کو کہا لیکن جب انہوں نے اثباتی جواب نہ دیا تو خاموش ہوگیا۔ بہرحال پورا قلعہ گھوم پھر کر انہوں نے کھانا بنانا شروع کیا جو رات دس بجے کے لگ بھگ پک کر تیار ہوا۔ میرے لیے اس وقت کھانا پینا محال تھا لیکن اردگرد پھیلی ہوئی مہک بتا رہی تھی کہ کھانا بے حد لذیذ اور عمدہ ہے۔ پورا دن ہم نے بغیر کچھ کھائے پیے گزار دیا تھا' پھر قلعے کی بلندی پر چڑھنے اترنے کی مشقت الگ تھی اور گھومنے پھرنے کی تھکن الگ۔ لہٰذا جیسے ہی کھانا تیار ہوا' سب ٹوٹ پڑے۔ چند لمحوں تک تو انہیں میرا خیال بھی نہ آیا لیکن جب انہوں نے محسوس کیا کہ میں کھانے میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہوں تو حیرت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے: ''سب سے زیادہ شور مچا رہے تھے اور اب دور کھڑے دیکھ رہے ہو' آؤ کھانا لو۔'' ان میں سے ایک نے کہا اور دوسروں نے بھی اس کی تائید کی۔

میں اُن پر اپنی کیفیت واضح کرتے ہوئے بولا: ''دراصل مجھے ایک بہت بڑی الجھن درپیش ہے۔ میں نے کبھی رات کو کھانا نہیں کھایا' جس مذہب کے ماننے والوں میں بدقسمتی سے میں پیدا ہوا ہوں ان کی تعلیمات کے مطابق رات کو کھانے پینے والا پکا جہنمی ہے۔ صرف ایک رات کے کھانے کی خاطر میں دوزخ میں نہیں جانا چاہتا لیکن میں بھوک کے مارے سو بھی نہیں سکوں گا۔ اور پھر تمہارے پکائے ہوئے کھانے کی مہک بھی اتنی اشتہا انگیز

ہے کہ...... بس کیا بتاؤں' سونا بہت مشکل ہے۔''

میرے اندر ایک زبردست کشمکش جاری تھی کہ ''کھاؤں یا نہ کھاؤں۔'' میری حالت اُس شخص کی مانند تھی جس کے آگے خندق ہو اور پیچھے کھائی۔ ابھی میں کوئی دوٹوک فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ تمام دوستوں نے مجھے کھانا کھانے پر آمادہ کرنا شروع کردیا۔ وہ کہنے لگے: ''تمہارے والدین اور گھر والے تو رہے ایک طرف' ہم کبھی بھی' کسی سے بھی یہ نہیں کہیں گے کہ تم نے رات کو کھانا کھایا تھا۔ اب آؤ اور کچھ نہ کچھ کھالو' یوں بھوکے رہو گے تو واقعی نیند نہیں آئے گی۔''

......اور میں نے کھانا کھالیا لیکن نیند نہ آسکی کیونکہ مجھے مسلسل متلی ہو رہی تھی۔ تمام رات قے پر قے آتی رہی۔ ایسا صرف میرے ہی ساتھ ہو رہا تھا' باقی سب سکون سے سوئے پڑے تھے۔ سبھی تھکے ماندے تھے لہٰذا پیٹ بھر کر سکھ کی نیند سو رہے تھے مگر میں بے خواب اور بے چین تھا۔ یہ میں ہی جانتا ہوں کہ وہ رات میں نے کتنے کرب میں گزاری تھی' صبح پانچ بجے تک میں جاگ رہا تھا۔

اُس خوفناک رات نے میرے ذہن میں یہ خیال سختی سے گاڑ دیا کہ رات کو کھانا خطرناک ہوتا ہے۔ صرف ایک بار کی بھول نے پوری رات کو دوزخ بنا دیا تھا...... لیکن صرف میرے لیے۔ میں نے سوچا کہ جو تمام عمر رات کو کھانا کھاتے رہتے ہیں اُن کے متعلق میرے بڑوں کا یہ عقیدہ کہ وہ دوزخ کا ایندھن بنیں گے...... شاید درست ہی ہو۔ لیکن پوری دنیا رات کو کھانا کھاتی ہے۔ اگر یہ عقیدہ سچ ہے تو پھر سبھی کو دوزخ میں جانا پڑے گا۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ چند ہزار افراد کے سوا باقی سب دوزخ میں پھینک دیے جائیں۔ میں انہی خیالات کی بھول بھلیوں میں سرگرداں تھا' دیر تک میں انہی خطوط پر سوچتا رہا کہ آخر خرابی کہاں ہے؟ پاس ہی میرے تمام دوست میری حالت سے بے نیاز گہری نیند کے مزے لوٹ رہے تھے' یہ سب کے سب رات کو کھانے کے عادی تھے' ان میں سے تو کسی کو قے نہیں آئی نہ ہی کسی کی نیند خراب ہوئی۔ آخرکار غور و فکر کی لہروں نے مجھے اس نتیجے کے ساحل پر لا پھینکا کہ خرابی کھانے میں نہیں اور نہ ہی رات کو کھانا کھانے والوں میں ہے۔ اگر کوئی خرابی اور گڑبڑ ہے تو وہ میرے عقاید و تصورات میں ہے اور میں ایک غلط عقیدے کے سائے تلے پروان چڑھا ہوں۔ اس روشن سوچ کے ذہن میں آتے ہی میں پرسکون ہوگیا۔

لیکن جب ایک بار تم کسی بات کو تسلیم کر لیتے ہو تو نتیجہ کے طور پر تمہارے باطن میں ایک جھوٹا ضمیر پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح کا ضمیر تمہارے ہاتھ میں ہر طرح کے کاموں کی دو

فہرستیں دے کر خود ڈانٹ ڈپٹ میں مصروف ہو جاتا ہے: یہ نہیں کرنا' وہ نہیں کرنا' یہ تو لازمی ہونا چاہیے' اس کام کو انجام دیئے بغیر نجات نہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ شعور نہیں' میں اسے بالکل شعور نہیں مانتا کیونکہ شعور کی موجودگی میں تو مصنوعی اور جھوٹے ضمیر کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ رہا شعور کا سوال' تو یہ ایک ایسی خوبی ہے جو صحیح اور غلط کا براہ راست فیصلہ کرتی ہے' اگر تم شعور یافتہ ہو تو تمہیں معلوم ہے کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تم ضمیر کو ساتھ لے کر پیدا نہیں ہوتے بلکہ اسے مذاہب پیدا کرتے ہیں۔ سبھی مذاہب نے اپنے اپنے ضمیر وضع کر کے انسان کا بیڑہ غرق کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ہم ایک اصطلاح کے طور پر لفظ ''ضمیر'' کو ترک کر دیں کیونکہ اس کے ساتھ ناقابل رشک ماضی اور غلط معانی وابستہ ہیں۔ متبادل لفظ کے طور پر ''شعور'' کو استعمال کریں۔ جب تم کامل طمانیت پا لیتے ہو تو تمہاری طمانیت کی خوشبو کا نام شعور ہے۔ طمانیت کا پھول اور شعور کی خوشبو...... دونوں کے لیے جد و جہد درکار ہوتی ہے۔

اور ہاں' اگر تم شعور کو پا جاؤ تو یہ تمہارے لیے حیات نو کے برابر ہوگا...... ایک نئی اور خوبصورت زندگی کے ساتھ زندہ رہو گے تم۔ یسوع (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) نے کہا تھا: ''جب تک تم مر کے دوبارہ پیدا نہ ہو جاؤ' مجھے نہیں سمجھ سکو گے۔'' یہ کہنے سے اُن کی کیا مراد تھی؟ سنو! میں بتاتا ہوں۔ وہ اگلے جنم کی بات نہیں کر رہے تھے بلکہ اُن کی بات کا مطلب یہ تھا کہ تمہیں اپنے باطن کو بدلنا ہوگا۔

اگر تمہارے اندر شعور ہے' طمانیت ہے اور غور و فکر کا مادہ ہے تو یہ کہنے کی قطعاً ضرورت نہیں کہ انسانیت ایک ہے' کیونکہ وہ تو ہے ہی۔ یہ احساس تمہیں خود بخود ہو جاتا ہے' مگر کب؟ جب تم حقیقی شعور یا ضمیر کو پا لیتے ہو۔ تب صرف بھائی چارہ ہی قائم نہیں ہوتا بلکہ جو نظام وجود میں آتا ہے' اس میں بھائی چارہ بھی ہوتا ہے اور بہن چارہ بھی۔ لیکن یہ شعور تک رسائی کے ثمر کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ یاد رکھو! ایسی تبدیلیاں کسی ''بنیادی انسانی حق'' کے اعلان سے ماوراء ہوتی ہیں۔

دوسری شق میں کہا گیا ہے کہ ہر فرد اس اعلامیے میں درج حقوق اور آزادیوں کو حاصل کرنے کا حقدار ہوگا اور اس حوالے سے رنگ' نسل' مذہب' ملک' خطے' زبان' طرز حیات' سماجی' سیاسی اور ثقافتی شناخت وغیرہ جیسے اختلافات کو اہمیت نہیں دی جائے گی۔

یہ سب بکواس ہے۔

میں جب امریکہ میں داخل ہوا تو سب سے پہلے یہ مطالبہ کیا گیا کہ تم حلفاً اعلان کرو کہ میں اُس مکتبہ فکر کا ہم خیال نہیں ہوں جو مخصوص خطوں میں' مخصوص لوگوں کی مخصوص حکومتوں کو تسلیم نہیں کرتا اور اراجک وادی کہلاتا ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اگر تم اراجک وادی ہو تو امریکہ میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

اراجک واد بھی ایک سیاسی مکتبہ فکر ہے۔ لیکن اس معاملے میں اُن کی دوُرخی پالیسی کی انتہا ہے کہ وہ کہتے کچھ ہیں' کرتے کچھ ہیں۔ میرے ساتھ تہذیب کے علمبرداروں نے انتہائی گھٹیا سلوک روا رکھا' اس سے میرا تو خیر کیا بگڑتا' وہ خود ننگے ہو گئے۔ میں تو تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ یہ لوگ جو ''انسانی حقوق'' اور ''تہذیبی کارناموں'' کے اعلان کرتے رہتے ہیں' انہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا تک نہ ہوگا۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ انہیں کوئی بھی پوچھنے والا نہیں ہے کہ اپنے اعلان پر خود کیوں عمل نہیں کرتے۔ ویسے بھی ہر ملک کے دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات تنازعات سے یکسر پاک نہیں ہیں' ہر ریاست داخلی اختلافات میں بھی گرفتار رہتی ہے اور خود اقوام متحدہ بھی ہر معاملے میں کبھی متفق نہیں ہوئی۔ ہر طرف اختلافات ہی اختلافات ہیں' ایسی عالمی صورتحال میں ایک اعلامیے کی کیا اوقات ہے کہ اُسے متفقہ سمجھ لیا جائے۔ لفظ ''متفقہ'' استعمال ضرور ہوا ہے' لیکن کچھ بھی متفقہ نہیں ہے۔ ہر کوئی اپنے اپنے مفادات اور تحفظات کی جنگ اپنی اپنی سطح پر لڑ رہا ہے۔ اپنی متعفن سیاست چمکانے کے لیے متفقہ اعلامیے جاری کرنے والے خود کو انسانیت کے محسن بنا کر پیش کر رہے ہیں حالانکہ یہی تمہارے دشمن ہیں۔

ان نام نہاد انسانیت پرستوں کے خلاف انسانیت کو ایک عظیم ہنگامہ برپا کر دینا چاہیے۔ وہ بد بخت ذاتی فوائد کی تگ و دو کو عوامی جنگ قرار دیتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ایسا کر کے انسانوں کے لیے ایک عظیم خدمت انجام دے رہے ہیں۔

کبھی بھارت ہی میں جھانک کر دیکھ لو' باقی ممالک میں کیا ہوتا ہے' یہ تو دور کی ہے۔ ایک ہی نوعیت کا کام ہوتا ہے' لیکن مرد کے مقابلے میں عورت کو بہت کم معاوضہ دیا

ہے..... اور ''متفقہ'' اعلامیے میں لکھا گیا ہے کہ ایک جیسے کام کا معاوضہ مرد اور عورت دونوں کو برابر ملنا چاہیے۔ محنت کا طے شدہ معاوضہ مرد یا عورت اور گورے اور کالے کی بنیاد پر گھٹایا بڑھایا نہیں جا سکتا۔ یہ اعلامیے میں تو تحریر کیا گیا ہے لیکن ایسا کون کرتا ہے اور کہاں کرتا ہے۔ سب غلط ہے' محض بکواس اور گمراہی پھیلانے کی سازش ہے۔

مجھے امریکہ کی چھ جیل خانوں کا ''مہمان'' بننا پڑا۔ یقین کرو چھ کی چھ جیلوں میں ایک بھی گورا قیدی نہیں تھا' سب سیاہ فام تھے۔ ہر قید خانے میں اسیروں کی گنجائش 600 سے 700 تک تھی۔ کیا امریکہ میں صرف سیاہ فام ہی جرم کرتے ہیں' سفید چمڑی والے آسمان سے اترے ہوئے فرشتے ہیں اور کیا یہ صورتحال ان کی منافقت کا پردہ چاک کرنے کے لیے ایک تسلی بخش ثبوت نہیں ہے؟ کیا یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے اعلامیے کے مطابق رنگ' نسل اور مذہب وغیرہ کی بنیاد پر کسی سے کوئی امتیازی رویہ اختیار کرنے کے خلاف ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو چھ جیلوں میں کم از کم چھ گورے تو دکھائی دیتے' لیکن نہیں' سفید فام لوگوں کے وسیع و عریض ملک میں تمام مجرم سیاہ فام ہیں۔

میں نے بے گناہی کے جرم کی سزا بھگتنے والے ان سیاہ فام ''مجرموں'' سے پوچھا..... کیا پوچھا' یہ میں ابھی بتاتا ہوں مگر پہلے جان لو کہ یہ ''کالے مجرم'' میرے مداح تھے' وہ مجھے بہت پیار کرتے تھے' انہوں نے بتایا کہ وہ گزشتہ کئی برسوں سے مجھے اخبارات' ریڈیو اور ٹی وی کی وساطت سے جانتے ہیں۔ شاید ان کے جیل پہنچنے کی بھی ایک وجہ میں ہی تھا' وہ میری کتابیں پڑھتے تھے اور بعد ازاں ان کتب کو دوسرے لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ جیل میں مجھے اپنے درمیان دیکھ کر وہ بہت خوش تھے کہ کم از کم کچھ وقت کے لیے تو انہیں میری صحبت میسر آئی۔ اُن کا کہنا تھا کہ وہ ان قیمتی لمحات کو کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے ... بہرحال' میں کہہ رہا تھا کہ میں نے ان سے پوچھا: ''تمہارا جرم کیا ہے؟ کیوں جیل میں بند ہو؟'' وہ بولے:

''آپ یقین کریں کہ ہم میں سے ایک بھی آدمی ایسا نہیں جو مجرمانہ ذہنیت کا حامل ہو یا جس کا وجود دوسروں کے جان و مال کے لیے خطرہ بن سکتا ہو' جس طرح آپ کو حراست میں لیا گیا ہے' بالکل اُسی انداز میں ہمیں بھی گرفتار کر لیا گیا' بغیر تلاشی اور گرفتاری کے عدالتی حکم نامے کے۔ ہر بار پوچھنے پر ہمیں یہی طفل تسلی دی جاتی ہے کہ کل تمہیں ہر صورت میں عدالت لے جایا جائے گا لیکن یہ ''کل'' کبھی نہیں آتی۔ اگر ایک طرف ہم اپنے جرم سے بے خبر ہیں تو دوسری طرف یہ بھی نہیں جانتے کہ کب تک امریکی قانون کی قید میں رہنا ہمارا مقدر

ہے..... بس' انتظار کی صلیب پر مصلوب ہیں۔''

ایک ''قیدی'' نے مجھے بتایا کہ وہ مسلسل نو ماہ سے پس دیوار زنداں ہے اور اس طویل قید کے دوران ایک بار بھی اُسے عدالت میں پیش نہیں کیا گیا..... اور ''متفقہ اعلامیہ'' یہ کہتا ہے کہ بلا وارنٹ گرفتاری نہیں ہونی چاہیے اور جب تک کسی آدمی پر جرم ثابت نہ ہو جائے اسے جیل نہیں بھیجا جا سکتا۔ ثبوت کی محتاجی جرم کو ہوتی ہے بے گناہی کو نہیں۔ بے گناہی کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہاں' کسی کو مجرم ثابت کرنے کے لیے لازمی ہے کہ اس کے خلاف ٹھوس ثبوت ہوں تاکہ جرم ثابت ہونے پر مجرم کو جیل بھیجا جا سکے' لیکن صورتحال برعکس ہو تو آپ کسی آزاد شہری کو قیدی نہیں بنا سکتے۔ یہ سب کہنے کی حد تک تو سچ ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ سفید جھوٹ دہرانے والے گورے لوگوں کے ''عظیم ملک'' امریکہ کی جیلوں میں مہینوں سے قید لوگوں کو یہ بھی علم نہیں ہوتا کہ آخر وہ کس جرم کی سزا بھگت رہے ہیں۔ جن لوگوں کو میں نے دیکھا وہ سب کے سب باہمت اور جوان تھے لیکن اُن کی ہمت اور جوانی جیل کی دیواروں سے بہرحال کمزور تھی۔

میں نے اس صورتحال کی وجہ جاننے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ واقعی انہوں نے کوئی غلطی نہیں کی' تو پھر انہیں قید کیوں کیا گیا؟ اس سوال کا جواب غور سے سنو! وہ باہمت جوان نسلی امتیاز کے خلاف تھے۔ وہ کالے لوگوں کے لیے بھی وہی حقوق طلب کرتے تھے جو گوروں کو حاصل ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ کوشاں تھے اور یہی اُن کا جرم بن گیا۔ انہیں عدالت میں اس لیے پیش نہیں کیا گیا کہ اگر عدالت نے انہیں رہا کر دیا تو وہ دوبارہ اپنی ''ناجائز سرگرمیاں'' شروع کر دیں گے۔ اسی خدشے کے تحت دنیا کے سب سے بڑے ''قانون پسند'' اُن ''خطرناک مجرموں'' کو جیلوں میں قید رکھے ہوئے تھے۔ ان بے گناہ لوگوں کو قید رکھنا امریکی حکمرانوں کا ایک ایسا جرم ہے جو مستقبل کے مؤرخ کبھی معاف نہیں کریں گے۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں' میں نے صرف چھ قید خانے دیکھے' وہاں کم از کم چار ہزار سیاہ فام محبوس تھے۔ شاید ایسے مزید لوگ دیگر جیلوں میں بھی ہوں۔ جیل میں میرے انہی سیاہ فام مداحوں نے مجھے بتایا کہ دنیا بھر میں بدنامی اور شدید دباؤ کے باعث امریکیوں نے آپ کو عدالت میں لے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ دنیا کے انصاف پسند طبقے آپ کے معاملے میں ہرگز خاموش نہیں رہے' عالمی ذرائع ابلاغ مسلسل یہ بات دہرا رہے ہیں کہ امریکی حکومت

کی پوری مشینری ایک نہتے اور بے گناہ آدمی کے خلاف مجرمانہ کارروائیوں کی مرتکب ہو رہی ہے بین الاقوامی شہرت یافتہ صحافیوں کی نگاہیں مسلسل آپ کے معاملے پر جمی ہوئی ہیں لہٰذا نہ چاہتے ہوئے بھی اب امریکی آپ کو عدالت میں پیش کر دیں گے۔ لیکن اس کے باوجود بھی بارہ دن ٹال مٹول میں گزار دیئے گئے جس جگہ پر میری گرفتاری عمل میں آئی تھی وہاں سے صرف پانچ گھنٹے کی پرواز کر کے اُس عدالت تک پہنچا جا سکتا تھا' جہاں مجھے پیش کرنا تھا۔ میرا اپنا جیٹ طیارہ موجود تھا۔ ہم نے انہیں یہ پیشکش بھی کی کہ عدالت میں پہنچنے کے لیے تم ہمارا جہاز استعمال کر سکتے ہو۔ یہ بھی کہا کہ اگر کوئی خدشہ ہے تو پائلٹ بھی اپنے لے آؤ۔

لیکن وہ صرف اپنے جہاز میں ہی سفر کرنا پسند کرتے تھے۔ اُن کی چالبازی تو یہ تھی کہ آج جہاز نہیں آیا' آج جہاز میں کوئی فنی خرابی پیدا ہو گئی ہے' آج پائلٹ بیمار ہے' آج موسم خراب ہے...... وغیرہ۔ پانچ گھنٹوں کے فضائی سفر کے لیے انہوں نے بارہ دن انتظار کرایا' وہ بھی جیل میں۔ واقعی یہ غیر معمولی تاخیر تھی مگر جب دیگر قیدیوں کے معاملے کو دیکھا جائے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ مجھے تو وہ بہت جلد عدالت میں لے گئے۔ صرف بارہ دن ...... کیا یہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی نہیں تھی؟

تمام حکومتیں ہر طرح کے غیر قانونی دھندوں میں ملوث رہتی ہیں' وہ ہر طریقے سے انسانی حقوق کو پامال کرتی ہیں اور یہ لوگ جو اُن حکومتوں کے بھی تھانیدار ہیں کتنی بے شرمی اور ڈھٹائی سے انسانی حقوق کے اعلامیے جاری کرتے ہیں۔

تیسری شق میں کہا گیا ہے کہ ہر انسان کو زندہ رہنے کی آزادی اور ذاتی تحفظ کا حق حاصل ہے۔

لیکن اس میں ذاتی خواہش سے مرنے کا ذکر نہیں حالانکہ یہ بہت اہم انسانی حق ہے۔ اپنے پیدا ہونے پر تو کسی کو کوئی اختیار نہیں ہے' باقی صرف موت بچتی ہے اور میرے خیال میں یہ انتخاب تمہارا بنیادی حق ہے کہ یا تو اپنی اجازت کے بغیر مر جاؤ یا پوری انسانی عظمت کے ساتھ مرو۔ اپنی خواہش سے مرو' موت کو موقع ہی نہ دو بلکہ جب زندگی مناسب حد تک بسر کر لو تو خود ہی آگے بڑھ کر موت سے ہمکنار ہو جاؤ۔

لیکن وہ اپنے اعلامیے میں موت کو شامل کرنے سے خوفزدہ ہیں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے پیشوا اور سیاسی حلقے ان کے خلاف ایک مزاحمتی طوفان

کھڑا کر دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلامیے تیار اور مشتہر کرنے والی قوتوں کے خیال میں ہر وہ بات جو تم تک پہنچائی جائے تسلی دینے والی ہونی چاہیے تاکہ تم جس طرح کی زندگی گزار رہے ہو' اس پر قانع رہو۔ جانتے ہو تم کس طرح کی زندگی گزار رہے ہو؟ تم کبھی نہیں جان سکتے۔ میں بتاتا ہوں کہ وہ تمہیں کس قسم کی زندگی سے چمٹے رہنے کا درس دیتے ہیں۔

گزشتہ برس کی دوسری ششماہی میں مغربی ملکوں کی عام منڈیوں میں اشیائے خورد و نوش کے انبار لگ گئے تھے لیکن دوسری طرف انہی دنوں ایتھوپیا میں ایک ہزار آدمی فی یوم کے حساب سے انسان مر رہے تھے۔ بیماریوں سے نہیں' بھوک سے۔ مغرب کے پاس اپنی ضرورت سے بہت زیادہ خوراک تھی لیکن کوئی ایتھوپیا کی غذائی امداد پر تیار نہ تھا۔ انسانی حقوق کے ٹھیکیداروں کو فاضل غذا سمندر کی گہرائیوں میں غرق کرنا پڑی اور افریقہ کے مجبور عوام کے پیٹ بدستور خالی رہے۔

غور سے سنو! "انسانیت کے دوستوں" نے جو غذا سمندر میں غرق کر دی اگرچہ اس کا بھوکے لوگوں تک نہ پہنچ پانا ایک المیہ ہے لیکن اس سے بھی بڑا المیہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے پیٹ بھرے ہوئے تھے انہیں فاضل غذا ٹھکانے لگانے کے لیے دو ارب ڈالر خرچ کرنا پڑے۔ واضح رہے کہ دو ارب ڈالر کا یہ خرچہ صرف ذرائع نقل و حمل اور غذا تلفی کے عمل پر ہوا' ضائع کردہ غذا کی قیمت اس میں شامل نہیں ہے جو اس سے کئی گنا زیادہ تھی۔ مغرب والوں کو اکثر ایسا کرنا پڑتا ہے' ہر چھ ماہ بعد وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ ہر ششماہی کے اواخر میں غذائی اشیاء کی بھرمار ہو جاتی ہے جو ضرورت سے زائد ہوتی ہیں' پیداوار کی نئی کھیپ نئی ششماہی کی آمد کے ساتھ ہی آنے والی ہوتی ہے لہٰذا گوداموں کی قلت کے بحران سے بچنے کے لیے انہیں ایسا کرنا پڑتا ہے۔ میں جن دنوں کی بات کر رہا ہوں یہ وہ سیاہ دن تھے جب ایتھوپیا میں انسانیت کو بھوک کے مارے چاند بھی روٹی جیسا نظر آ رہا تھا لیکن "سیاہ فام انسانیت" کی امداد نہیں کی گئی۔ کیا تم "سفید فام انسانیت" کا یہ جرم معاف کر سکتے ہو؟

بھارت میں آدھی سے زیادہ آبادی جو غذا کھاتی ہے وہ طبی حوالے سے متوازن غذا کے معیار اور مقدار کے مطابق نہیں ہوتی۔ گویا پچاس فیصد بھارتی غذائی کمی کا شکار ہیں۔ لیکن یہ خوش قسمت ہیں کہ کچھ نہ کچھ کھا رہے ہیں کیونکہ "بھارت ماتا" کی پچیس فیصد اولاد تقریباً بھوکی سوتی ہے۔ یہ اعداد و شمار میں نے تیار نہیں کیے بلکہ یہ انہی لوگوں کے "دانشوروں" کی کاوش ہیں جو فاضل غذا کو اربوں ڈالر خرچ کر کے گہرے پانی کی نذر کر دیتے ہیں۔ یہ انہی

کے سروے میں لکھا ہے کہ دیہاتی علاقوں کے بھارتی باشندوں کی پچاس فیصد تعداد صرف ایک وقت کھانا کھانے پر مجبور ہے...... اور یہ کھانا تاج محل ہوٹل کا کھانا نہیں ہوتا بلکہ یہاں کھانے سے مراد ہے۔ روٹی' نمک اور تھوڑی سی چٹنی...... کیا یہ کھانا ہے؟ کیا یہ غذا ہے؟ کیا تیسری دنیا کے رہنے والوں کی قسمت میں یہی زندگی بھگتنا لکھا ہے۔ جب تک ہم پہلی دوسری اور تیسری دنیا کی فرضی اصطلاحوں سے آزاد نہیں ہو جاتے' جب تک دنیا ایک نہیں ہو جاتی تب تک زندہ رہنے کے لیے ضروری غذا کی ہر انسان کو فراہمی ناممکن ہے۔

وہ فالتو غذا سمندر میں ڈبو کر بھوکے ننگے لوگوں سے کہتے ہیں کہ تمہیں اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا بنیادی انسانی حق حاصل ہے۔ کون سی زندگی؟...... لوگ تو مر رہے ہیں...... ایتھوپیا میں' بھارت میں' ہر جگہ۔ لیکن یورپ کی طرح امریکہ بھی غذا تلفی میں مصروف ہے' سٹالن نے بھی روس میں یہی کچھ کیا تھا۔ امریکہ ہر تین ماہ بعد کروڑوں ڈالر خرچ کر کے اربوں ڈالر کی فالتو غذا سمندر برد کرتا ہے اور سٹالن کے دور میں روسی ریلوے کی گاڑیوں میں کوئلے کی جگہ گندم جلائی جاتی تھی' کیونکہ گندم کوئلے سے سستی اور وافر تھی...... دنیا کے دوسرے خطوں میں لوگ بھوکے ہیں تو رہیں بھوکے' انہیں کیا۔ اگر کہیں انسانیت بھوک سے نڈھال ہو کر موت کی وادی میں اتر رہی ہے تو کوئی پروا نہیں' کیونکہ ان کی ذمہ داری تو محض اعلامیے جاری کرنا ہے' جن میں یہ درج ہو کہ تم اپنی مرضی سے زندہ رہ سکتے ہو۔

اعلامیے کی نویں شق میں درج ہے کہ کوئی آدمی غیر قانونی گرفتاری' نظر بندی یا جلاوطنی کا نشانہ نہیں بنایا جائیگا۔

یہ بھی جھوٹ کے پلندے میں شامل ایک جھوٹ ہے کیونکہ ہر ملک میں یہ مکروہ عمل جاری ہے۔ میں خود غیر قانونی گرفتاری اور نظر بندی کا نشانہ بنایا گیا' اس لیے میں اس بات کا گواہ ہوں کہ ''انسانی حقوق کے مشترکہ بین الاقوامی اعلانیے'' کی ہر جگہ خلاف ورزی کی جاتی ہے' خاص طور پر برطانیہ اور امریکہ وغیرہ میں۔ یاد رہے کہ امریکہ اس اعلامیے کے پیشکاروں میں سرفہرست رہا ہے' اور وہاں میرے ساتھ جو ہوا تم اس سے آگاہ ہو' لیکن برطانیہ بھی اس دوڑ میں پیچھے نہیں رہا' اور ''بااصول'' انگریزوں کی دھرتی پر مجھے غیر قانونی طور پر حوالات میں بند رکھا گیا...... الزام یہ تھا کہ من مانی کی گئی ہے۔ حالانکہ میں آج تک نہیں جان سکا کہ میں نے کیا من مانی کی تھی۔ میں تو صرف ہوائی اڈے کے پہلے درجے کے لاؤنج میں چھ گھنٹے

گزارنے کا خواہشمند تھا کیونکہ میرے ذاتی جہاز کے پائلٹوں نے اپنی ڈیوٹی کا دورانیہ مکمل کر لیا تھا اور اب انہیں آرام کی اشد ضرورت تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ بارہ گھنٹے تک مسلسل پرواز کر سکتے تھے' اس سے زیادہ دیر تک جہاز اڑانا ان کے لیے ممکن نہ تھا اور اگر ایسا کیا جاتا تو جہاز اڑانے والوں کی شدید تھکن یا غنودگی کے باعث کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا تھا۔ اس صورتحال میں ہمارا قیام ضروری تھا۔

میرے پائلٹوں نے کہا کہ وہ لوگ یہ نکتہ اٹھا کر اعتراض کر سکتے ہیں کہ پہلے درجے کا لاؤنج تو پہلے درجے کے ہوائی مسافروں کے لیے ہے اور ذاتی ہوائی جہاز میں سفر کرنے والے لوگ ''مسافر'' قرار نہیں دیے جا سکتے' یوں وہ لاؤنج میں قیام کے حقدار بھی نہیں ہیں۔

اس امکانی اعتراض کے پیش نظر میں نے اپنے لوگوں کو پہلے درجے کے ٹکٹ خرید کر پاس رکھنے کو کہا تاکہ وہ لوگ کوئی بہانہ نہ تراش سکیں۔

پھر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا' انتظامیہ کے لوگوں نے ذاتی طیارے میں سفر کرنے کے باعث ہمیں ''باقاعدہ مسافر'' تسلیم کرنے سے انکار کر دیا...... یہ صورتحال پیدا ہوئی تو ہم نے ٹکٹ شو کر دیئے۔

ٹکٹ دیکھ کر ہم سے بحث کرنے والا سکیورٹی افسر دنگ رہ گیا۔ اس نے خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ ذاتی طیارے میں سفر کرنے والوں نے ٹکٹیں بھی لے رکھی ہوں گی۔ اس کی حیرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے میں نے کہا ''اب ہم پہلے درجے کے ہوائی سفر کی ٹکٹیں رکھنے والے ''باقاعدہ مسافر'' ہیں لہٰذا ہمیں فرسٹ کلاس لاؤنج میں جانے دو۔''

وہ بولا ''میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اب مجھے ایک بار پھر ''اوپر'' اطلاع دینی ہوگی تاکہ نئی صورتحال کے مطابق کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔''

جس آدمی کو ''اوپر'' اطلاع دی گئی' لگتا ہے کہ وہ خود برطانوی وزیراعظم تھا کیونکہ جب سکیورٹی افسر چلا گیا تو میں نے اس کی فائل دیکھی جو وہ استقبالیہ کاؤنٹر پر ہی چھوڑ گیا تھا۔ فائل سے معلوم ہوا کہ مجھے تنگ کرنے کے لیے انتہائی اعلیٰ سطح پر فیصلہ کیا گیا تھا۔

میں وہاں جانے کا شوق رکھتا تھا نہ میں نے کبھی برطانیہ کے ویزے کے لیے درخواست دی تھی لہٰذا انہیں میرے معاملے میں اتنا بے چین ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن انہوں نے پارلیمینٹ سے یہ قرارداد منظور کروائی کہ اگر میں برطانیہ میں آنا چاہوں تو مجھے اس کی ہرگز اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔

بہرحال کچھ دیر بعد ہمارے ساتھ بحث کرنے والا سکیورٹی افسر واپس آیا تو میں نے کہا: ''مجھے لندن کی سڑکوں پر آوارہ گردی کا کوئی شوق نہیں اور اگر تمہارا پورا ملک بھی فرمائش کرے تو میں پھر بھی انگلینڈ نہیں آنا چاہوں گا۔ مجھے گوروں کے دیس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے تو صرف چند گھنٹے فرسٹ کلاس لاؤنج میں گزارنے ہیں اور بذریعہ لاؤنج کسی ملک میں داخل ہونا ناممکن ہے' لاؤنج بند ہے اور ہوائی اڈے کا حصہ ہے۔ لہٰذا لاؤنج میں ٹھہر کر بھی ہم ہوائی اڈے پر ہی مقیم تصور کیے جائیں گے۔ ویسے بھی ہم اس وقت ایک ایسے ہوائی اڈے پر ہیں جو عالمی قوانین کی رُو سے بین الاقوامی ہوائی اڈہ کہلاتا ہے اور انگلینڈ کا حصہ نہیں ہے۔''
لیکن اس نے جواب دیا:

''میں کیا کرسکتا ہوں؟ آپ کے معاملے میں اوپر سے بہت زیادہ دباؤ ہے کہ اگر وہ اپنی ضد پر قائم رہیں تو حوالات بھیج دیا جائے۔ اب یہاں مزید قیام کی ایک ہی صورت ہے کہ آپ جتنے گھنٹے بھی گزارنا چاہیں' حوالات میں گزاریں۔''

یوں مجھے چھ گھنٹوں کے لیے حوالات میں بند کردیا گیا' الزام من مانی کا لگایا گیا لیکن میں نے تو کوئی من مانی نہیں کی تھی' میرا موقف تو انہی کے بنائے ہوئے اصولوں اور قوانین کے مطابق تھا' پھر میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا گیا؟ میں نے کوئی جرم تو نہیں کیا تھا' میرے پاس ٹکٹ تھا' اپنا ہوائی جہاز تھا' مجھے صرف آرام کرنا تھا۔ مگر جن لوگوں کی مکروہ شکلوں کو میں لوگوں کے سامنے لاتا رہا ہوں' وہ مجھ سے اس قدر خوفزدہ ہو گئے تھے کہ انگلینڈ کے ہوائی اڈے کے لاؤنج میں میرا چھ گھنٹے آرام کرنا بھی انگریزوں کے مذہب' ان کی پارسائی اور عقائد کے لیے خطرناک قرار دے دیا گیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں لاؤنج میں چند گھنٹے رک کر کہیں ان کی نوجوان نسل کو ''گمراہی'' کی دلدل میں نہ دھکیل دوں۔ یہ ہے ان لوگوں کی ذہنی حالت جو تمہارے لیے انسانی حقوق کی فہرستیں تیار کرتے پھر رہے ہیں۔

یہ لوگ انسان سے محبت نہیں کرتے اور نہ ہی اُن کے دلوں میں انسانی فضیلت کے لیے کوئی احترام ہے۔ ان کی بظاہر ٹھوس نظر آنے والی باتیں معنوی طور پر پانی کے بلبلوں کی طرح ناپائیدار ہیں۔

اٹھارہویں شق کی رُو سے ہر آدمی کو اپنے نظریات کے مطابق ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ذاتی مذہب پر عمل کرنے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ جو چاہے اور جب چاہے اپنا مذہب یا عقیدہ بدل سکتا ہے۔ اس حق میں انفرادی یا اجتماعی صورت میں اپنے مذہب یا عقیدے پر عمل' مذہبی تعلیم و تدریس اور عبادت و ریاضت کی آزادی بھی شامل ہے۔

غور کرو! یہ ذاتی نظریات رکھنے اور ان کا اظہار کرنے کی آزادی دے رہے ہیں..... اور میں نے بھی یہی کیا تھا۔ اگر یہ حق بنیادی انسانی حقوق میں حقیقتاً شامل ہے تو پھر دنیا کی کسی بھی حکومت کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے کیونکہ میں اپنے ذاتی نظریات کا اظہار ہی تو کر رہا ہوں۔ میں کسی قسم کی سیاست کرنے کا ارادہ رکھتا تھا نہ طاقت کے حصول میں کوشاں تھا۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ جو دیکھتا ہوں..... اور اندھے سیاستدانوں سے بہتر دیکھتا ہوں جن کی آنکھیں طاقت کے خمار سے بوجھل ہیں..... اُسے جوں کا توں بیان کر دیتا ہوں۔ اس لیے یہ مجھ سے خوفزدہ ہیں۔

کچھ ہی عرصہ پہلے پوپ نے مذاہب عالم کے حوالے سے ایک بین الاقوامی کانفرنس کا اہتمام کیا تھا۔ اس سلسلے میں تمام مذاہب کے بڑے بڑے علماء کو دعوت نامے بھیج کر بلایا گیا۔ کانفرنس سے چند دن پہلے اٹلی میں مقیم میرے مداحوں نے مجھے بذریعہ خط مطلع کیا کہ مقامی آبادی تو اس کانفرنس میں آپ کی شرکت کی پرزور حمایت کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ آپ کو بھی دعوت نامہ ارسال کیا جائے لیکن پوپ ہے کہ مانتا ہی نہیں۔ اٹلی کی حکومت گزشتہ آٹھ ماہ سے سوچ رہی ہے کہ آپ کو ویزا دینا چاہیے یا نہیں۔ اس سوچ و بچار کے طول کا باعث بھی پوپ ہی ہے جو ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ یہاں آسکیں۔

یہ ہے صورتحال' اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہر کسی کو ذاتی نظریات کے اظہار کی مکمل آزادی کا حق حاصل ہے۔ ہمارے ہاں یہ خیال بہت عام ہے کہ مغرب میں اظہار رائے کی

آزادی سے پیار کیا جاتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہاں کسی کو اظہار رائے کی آزادی سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔

یہ نظریات کے اظہار کی کون سی آزادی کی بات کرتے ہیں؟...... پوپ نے میری کتابوں کو سیاہ فہرست میں شامل کر رکھا ہے تاکہ کوئی کیتھولک عیسائی انہیں پڑھ نہ سکے۔ قرون وسطیٰ میں تو یہ ہوتا تھا کہ جب بھی پوپ کسی کتاب کو سیاہ فہرست میں درج کرتا تھا تو اس فیصلے کی تشہیر کی جاتی تھی اور نتیجہ کے طور پر وہ کتاب یورپ میں ہر جگہ' جہاں بھی پائی جاتی' جلا کر خاک کر دی جاتی تھی۔ اگرچہ اب وہ دور تو نہیں رہا ہے' لیکن اب بھی وہ یہ پابندی لگا سکتے ہیں کہ کوئی کیتھولک کسی ''متنازعہ کتاب'' کو نہ پڑھ سکے۔ کیتھولک لوگ بہت بڑی جماعت ہیں' ان کی تعداد ستر کروڑ کے لگ بھگ ہے' وہ بجائے خود ایک دنیا ہیں۔ لوگوں کی اتنی بڑی تعداد کو کسی خاص کام کو سرانجام دینے سے روک دینے کا صرف اور صرف یہی مطلب ہے کہ آپ نہ صرف شکست کھا چکے ہیں بلکہ اپنی ہزیمت کو تسلیم بھی کرتے ہیں۔ پوپ کی طرف سے میری کتابوں پر پابندی کا محض یہی مطلب ہے کہ ان کے پاس میرے سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔ میں نے تم پر واضح کر دیا ہے کہ وہ اظہار رائے کی آزادی کو برداشت نہیں کر سکتے اور انسانی حقوق کا اعلان سیاسی بکواس بازی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔

انیسویں شق میں تحریر ہے کہ ہر شخص کو اظہار رائے کے علاوہ اظہار ذات کی آزادی کا بھی پورا حق حاصل ہے اور اس حق میں بلاخوف و خطر کسی معاملے میں ذاتی رائے رکھنے' ریاستی حدود کی پروا کیے بغیر ذرائع ابلاغ کی مدد سے اطلاعات و معلومات تلاش کرنے اور انہیں اپنے پاس رکھنے کا حق بھی شامل ہے۔

یہ بالکل غلط ہے۔ بھارتی پارلیمنٹ نے اخبارات و جرائد سے وابستہ لوگوں اور ذرائع ابلاغ کی دنیا کے بڑے بڑے اداروں سے اپیل کی کہ وہ میرے بیانات کو نظر انداز کر دیا کریں' انہیں زور دے کر یہ کہا گیا کہ ان کی اشاعتی و نشریاتی سرگرمیوں میں میرے

خیالات کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ امریکی حکومت نے بھارتی حکمرانوں پر دباؤ ڈالا کہ کسی بھی مغربی صحافی کو میرے پاس نہ جانے دیا جائے اور یہ بات یقینی بنائی جائے کہ غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے نمائندے میرے آشرم کی تقریبات کی کوریج کر سکیں نہ میرے انٹرویو ریکارڈ کر پائیں۔

امریکی حکومت کے دو ہی مطالبے تھے۔ پہلا یہ کہ مغربی دنیا کے تمام ممالک مجھے اپنے ہاں آنے کی ہرگز اجازت نہ دیں اور دوسرا یہ کہ ہر صورت میں میرے جہاز کا رُخ بھارت کی طرف موڑ دیا جائے۔ اسی وجہ سے تقریباً ہر ملک کی پارلیمینٹ نے اس نوعیت کی قراردادیں منظور کیں کہ مجھے ان کے ملک میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے' یہاں تک کہ تین ہفتے کا سیاحتی ویزا بھی میرے لیے ممنوع قرار پا گیا۔

امریکی حکومت کا منصوبہ یہ تھا کہ مجھے بھارت کے علاوہ کسی بھی ملک میں داخلہ نہ ملے اور جو لوگ مجھے ملنے کے خواہشمند ہیں انہیں بھارت میں داخلہ نہ ملے۔ ان منافقوں کا خیال ہے کہ ایسا کر کے وہ انسانی بھلائی کی ہماری جدوجہد کو ختم کر دیں گے۔

ایک طرف تو یہ حقائق ہیں جو اُن کے سیاہ باطن کی عکاسی کرتے ہیں اور دوسری طرف ان کی منفی سرگرمیاں جو بے معنی لفظوں سے جھوٹے اعلامیے ترتیب دینے اور ان کا اعلان کرنے تک محدود ہیں۔ انسانی حقوق کی پاسداری کے معاملے میں وہ کہاں کھڑے ہیں؟ مجھے امید ہے کہ میری گفتگو سے تمہیں اس سوال کا جواب بخوبی مل گیا ہوگا۔

تیسویں شق میں کہا گیا ہے کہ ہر آدمی کو اپنی شخصیت اور اعلیٰ اوصاف کو آزادانہ طور پر نکھارنے کا حق حاصل ہے۔

میرے خیال میں ایسا کہنا صحیح نہیں ہے۔ تم ہی بتاؤ' کیا تمہیں اپنی ہستی اور خوبیاں نکھارنے کی آزادی حاصل ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ لوگ جو یہ اعلان کرتے پھرتے ہیں انہیں یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ جسے وہ انگریزی میں پرسنالٹی (شخصیت) کہتے ہیں وہ تمہاری ذات کا حصہ نہیں ہے۔ تمہاری ذاتیت ہی تمہاری حقیقی حالت ہے' جسے تم نے تلاش کرنا ہے' لیکن انسانیت کا کوئی ''خیر خواہ'' اس کا تذکرہ تک نہیں کرتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ انہوں نے آج تک کبھی اس انداز میں سوچا ہی نہیں ہے' اور یہی سبب ہے کہ وہ سب لوگ ابھی تک مصنوعی

شخصیت کے خول میں زندگی گزار رہے ہیں۔انہوں نے ابھی اپنی حقیقی حالت کو بیدار ہی نہیں کیا اور نہ شعور کی منزل تک رسائی پائی ہے۔

شخصیت کے لیے وہ ایک بدصورت اور گھٹیا لفظ استعمال کرتے ہیں: پرسنالٹی۔ اس کا مطلب ہے: مصنوعی چہرہ۔ کیونکہ لفظ ''پرسنالٹی'' نے جس لفظ سے جنم لیا ہے وہ ہے پرسونا یعنی مصنوعی چہرہ ...... اور میں ہرگز نہیں چاہتا کہ ایسی شخصیت کے ساتھ زندہ رہا جائے جو مصنوعی ہو۔ میں اصلی چہرے کے ساتھ زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ لوگ خوبصورت ہوں' آتش مزاج دھبے پڑ جائیں' دنیا دلکش ہو اور ایسا خود بہ خود ہو۔

چھبیسویں شق کے مطابق تمام بچوں کو...... خواہ وہ شادی شدہ ماں باپ کی اولاد ہوں یا غیر شادی شدہ ماں باپ کی...... یکساں سماجی محافظت حاصل ہوگی۔

جو کہا گیا ہے اگر یہ سچ ہے تو پھر ایسا کہنا شادی کی ضرورت سے انکار کے مترادف ہے۔ اگر شادی شدہ اور غیر شادی شدہ والدین کی اولاد کو مساوی حقوق حاصل ہوں تو شادی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے' ایسی صورت میں بیاہ رچانے کا کیا مطلب؟ لیکن اعلامیہ گھڑنے والوں میں یہ تلخ نوائی نہ' اور اسے تسلیم کرنے کے لیے درکار اخلاقی جرأت سرے سے مفقود ہے۔

تم سب جانتے ہو کہ دنیا میں کہیں بھی غیر شادی شدہ والدین کی اولاد کو وہ اہمیت اور عزت نہیں دی جاتی جو شادی شدہ والدین کے بچے کو حاصل ہوتی ہے۔ بن بیاہی ماں کے بچے کو ہر سطح پر اور ہر طرح مسترد کیا جاتا ہے۔ کیا یہ بات اہل مغرب سے مخفی ہے؟ نہیں' وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن جاتے ہیں تاکہ منافقانہ نعروں سے تمہیں بہلاتے پھسلاتے اور اپنے مخصوص مفادات کو حاصل کرتے رہیں۔

اُن کے اعلامیے کو میں کوڑے کا ڈھیر تصور کرتا ہوں اور آج مجھے کوڑے کے ڈھیر پر گفتگو کر کے اپنا وقت برباد کرنا پڑا ہے۔ جو لوگ اس نوعیت کے اعلامیوں کو ہتھیار بنا کر دنیا کو کٹھ پتلی کی طرح اپنے اشاروں پر نچانا چاہتے ہیں' ذہنی ہتھوڑوں کی ضربوں سے ان کے سر کچل دینے کی ضرورت ہے' انہوں نے انسانیت کو غلام بنا کر رکھ دیا ہے اور اس عمل کو اب مزید

آگے ہرگز نہیں بڑھنے دینا چاہیے' ورنہ انسانیت غلامی کی کھائی سے موت کی خندق میں جا گرے گی۔

مغرب کے منافقوں کو انسانی حقوق کے اعلامیے جاری کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

یہ حق ہمارا ہے۔

کیونکہ ہم ہی موزوں انسان ہیں جو یہ کام کر سکتے ہیں۔

جہاں تک میرا اور میرے لوگوں کا تعلق ہے تو ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ آزادی' محبت اور انسانیت سے معمور زندگی جئیں گے' آزادی محبت اور انسانیت کو زندگی تصور کریں گے اور اپنی انفرادیت کو نکھاریں گے۔ جو بھی ہمیں پکارے گا' ہمیں دعوت دے گا اور ہمارا خیر مقدم کرے گا' ہم اس کی مدد کریں گے۔

صرف ایک ہی حق' بنیادی حق کہلا سکتا ہے اور وہ ہے ذاتِ برتر بننے کا حق۔

جب تک تم اپنے باطن میں غوطہ زن ہو کر ذاتِ برتر کو حاصل نہیں کر لیتے' تب تک ہر چیز مٹی بھر خاک کے برابر ہے۔ لیکن جب تم باطنی خدائی کو پا لیتے ہو تو سب کچھ تمہارے قدموں پر ڈھیر ہوتا چلا جاتا ہے۔

✿ ✿ ✿ ✿

?

پیارے مرشد!

چند دن پہلے آپ نے "انسانی حقوق کے متفقہ عالمی اعلامیے" کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ہمیں آگاہ کیا کہ یہ انسان کی موجودہ جسمانی، ذہنی اور روحانی غلامی کو بدستور قائم رکھنے کا ایک حربہ ہے۔ آپ کی فکرافروز باتوں سے معلوم ہوا کہ مغرب کی مکروہ حکمت عملی دراصل ایک گہری اور خوفناک سازش ہے جس کا ہدف غیر محفوظ انسانیت ہے۔ وہ لوگ یہ کبھی نہیں چاہیں گے کہ ہم شعور اور ضمیر تک رسائی پا جائیں اور آگاہی کی دولت سے مالا مال ہوں۔ اس کے برعکس وہ کوشش کریں گے کہ انسان اپنی اصل طاقت، باطنی جذبے اور سچی توقعات کے معاملے میں جاہل ہی بنا رہے، اور اسی میں ان کا بھلا ہے، کیونکہ جب تک انسانیت جہالت کے دام میں گرفتار ہے، تب تک عالمی استعماری قوتوں کی سرکوبی ممکن نہیں۔ گویا انسانی جہالت انسان دشمن قوتوں کی بقا کا تقاضا ہے۔ پیارے مرشد! اس صورتحال کا تقاضہ ہے کہ ازراہ کرم اب آپ اپنی طرف سے انسانی حقوق کا وہ اعلامیہ جاری کریں جو انسانیت کے تحفظ اور فلاح کا ضامن ہو۔ نیز بتائیں کہ کیا ہم گزشتہ لیکچر کو درست انداز میں سمجھ پائے ہیں یا نہیں؟

نئے انسان کے لیے نئے انسانی حقوق

تم بالکل صحیح سمجھے ہو! انسان اب بھی کئی طرح کی غلامیاں بھگت رہا ہے' انسانیت بہت سی ان دیکھی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور انسانی آزادیاں صرف زبانی وعدوں تک محدود ہیں۔ اگر صورتحال اس کے برعکس ہوتو کسی بھی طرح کے انسانی حقوق کی فہرست سازی کی ضرورت نہ پڑے' انسانی حقوق کے اعلامیے تبھی جاری ہوتے ہیں جب انسانی حقوق کی پاسداری کا تصور دم توڑ چکا ہو' ایسے نعروں کی ضرورت اُسی وقت پیش آتی ہے جب انسانی ضمیر گہری خاموشی میں پڑا سسک رہا ہو اور یہ ضرورت اس حقیقت کی غمازی کرتی ہے کہ ہزاروں سال سے انسانیت کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے' انسانوں کو فریب دیا جا رہا ہے اور انہیں سامراجی مفادات کی پاسبانی کا فریضہ انجام دینے والے ادارے چند ایسے جھوٹ جبراً منوا رہے ہیں جنہیں خوبصورت الفاظ میں دہرایا جاتا ہے۔

یہ فریب کاری اتنے دلکش اور موثر انداز میں جاری ہے کہ جب تک تم "مخصوص انسانیت" کی سطح سے بلند ہوکر نہ دیکھو حقائق دکھائی ہی نہیں دیتے۔ انسانیت کے امریکی یا مغربی تصور کے بندھنوں میں گرفتار ہوکر تم کبھی نہیں جان سکتے کہ انسانیت تعصب' مفاد اور ہوس کی کون کون سی غاروں میں محبوس کردی گئی ہے۔ ہر کوئی قید ہے' بہت سی خفیہ جیلیں ہیں جنہیں تم روایتی انداز میں سوچ کر کبھی تلاش نہیں کر سکتے۔ جو سوال تم نے کیا ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ انسانی حقوق کے میرے اعلامیے میں دس نکات اہم ترین ہیں:

(1) زندگی

انسان کو اپنی ترجیحات کے مطابق زندہ رہنے کا حق حاصل ہے اور اس حق میں تین مزید ضمنی حقوق بھی شامل ہیں جو نہ ہوں تو زندگی کے بارے میں یہی کہا جائے گا کہ "حق تو یہ

ہے کہ حق ادا نہ ہوا''۔

پہلا ضمنی حق ہے: تندرستی کے حصول کا حق

دوسرا ضمنی حق ہے: ذاتی ترقی کا خواب پورا کرنے کا حق

تیسرا ضمنی حق ہے: مذہبی توقعات کی تکمیل کا حق

پھولوں کی طرح مہکتی اور کھلی ہوئی معاشرتی فضا بھی ہر انسان کا بنیادی حق ہے جس میں وہ اپنی ترجیحات کے مطابق اپنی زندگی سے لطف اندوز ہو سکے۔ ایسی مثالی فضا ہی انسانی ترقی کی ضامن ہے کیونکہ ہر انسان ہر طرح کی قابلیت کے جوہر پیدائشی طور پر اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن فرد کی طبع میں موجود ان بیجوں کی افزائش کے لیے سماج مناسب زمین' موزوں دیکھ بھال اور محبت بھرا پرتعاون ماحول فراہم نہیں کر پاتا۔ ورنہ اگر ایسا ہو جائے تو ہر ذرہ جس جگہ ہو وہیں آفتاب ہو۔

مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تمہارا سماج تمہارے اندر موجود ہر طرح کی صلاحیتوں کے بیجوں کو تناور درختوں کی صورت میں پروان چڑھانے کی بجائے انہیں تباہی و بربادی کا تحفہ پیش کرتا ہے۔ آج کا سماج فرد کے چاروں طرف انتہائی زہریلا ماحول تخلیق کرتا ہے جو نفرت' ہلاکت اور تشدد سے بھرپور ہوتا ہے۔ زندہ رہنے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کے حق کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کسی بھی جگہ فسادات نہیں ہونے چاہئیں۔ اس کا یہ مفہوم بھی ہے کہ کسی کو فوج میں بھرتی ہونے کے لیے یا لڑائی میں حصہ لینے پر مجبور نہ کیا جائے۔ ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ زندگی سے پیار کرتا ہے تو فوجی بھرتی یا جنگ کو مسترد کر سکے لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے۔

ہزاروں لوگ قید خانوں کی بلند و بالا دیواروں کے اُس پار بنی غیر انسانی کوٹھڑیوں میں محبوس ہیں' یہ جگہ کسی انسان کے رہنے کے لیے کوئی مثالی جگہ تو نہیں کہ جسے چاہو پکڑ کر جیل میں بند کردو۔ قید خانوں میں اسیر لوگوں کی بڑی تعداد ان نوجوانوں پر مشتمل ہے جو اپنے آپ پر اعتماد رکھتے ہیں اور ہر بات پر عقلی انداز میں رائے دیتے ہیں۔ ایسے تمام نوجوان وہ ہیں جنہوں نے جنگ میں شامل ہونے سے انکار کردیا اور پھر یہی انکار ان کا جرم بن گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم انسانی ہلاکت کی کسی بھی بہیمانہ اور وحشیانہ سرگرمی میں شرکت کے خلاف ہیں اور یہی بات انسان دشمنوں کے لیے ناقابل برداشت ہے۔

انسان کوئی ایسی چیز تو نہیں ہے کہ تم بلاسوچے سمجھے ہی اس کی تباہی و بربادی کے

منصوبے بنالو اور پھر ان منصوبوں پر عمل کرنے کے لیے کمر کس لو۔ انسان تو ترقی کا جیتا جاگتا پرچم ہیں' امن کی علامت ہیں اور رواداری کا استعارہ۔ انسانوں کو کسی بھی مفاد' لالچ یا ہوس کی خاطر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ مقصد مذہبی ہو یا غیر مذہبی' سیاسی ہو یا غیر سیاسی' سماجی ہو یا غیر سماجی اور عقلی ہو یا غیر عقلی' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ انسان ہر مقصد سے مقدم ہے لہٰذا ''مقاصد'' پر ''انسانی قربانی'' کی قبیح رسم کا کوئی جواز نہیں ہے' جب انسان ہی نہ ہوں گے تو تمہارے مذموم مقاصد کہاں جائیں گے۔ لہٰذا انسان دشمنوں کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ کسی بھی طرح کے غیر انسانی مقصد کا مجسمہ بنا کر اس کے پاؤں انسانی خون سے دھونے کی کوششیں ناجائز ہیں۔ انسانی جان لے کر خوش ہونے والا کوئی دیوی دیوتا انسان سے اہم اور مقدس قرار نہیں دیا جا سکتا۔

یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ انجمن اقوام متحدہ انسانوں کے بنیادی حقوق کا اعلان تو بڑے دھڑلے سے کرتی ہے لیکن ان ہزاروں لوگوں کے بارے میں گونگی' بہری اور اندھی بن جاتی ہے جو قید خانوں میں اپنی زندگی برباد کر رہے ہیں۔ ان کے کوئی حقوق نہیں ہیں یا وہ انسان ہی نہیں ہیں؟ یہ بے حسی کیوں اختیار کی جاتی ہے؟ شاید اس لیے کہ انہوں نے زندگی کی بربادی کے لیے رچائی جانے والی جنگوں میں شامل ہونے سے انکار کردیا' لیکن بات صرف یہیں پر ختم نہیں ہوجاتی بلکہ اس کشمکش کی جڑیں بہت گہری ہیں اور پہلے ان کا سراغ لگانے کی ضرورت ہے۔

زندگی سے لطف اندوز ہونے کے حق کا حصول ایک مختلف اور منفرد ماحول میں ہی ممکن ہوسکتا ہے لیکن ایسا ماحول آج وسیع و عریض دھرتی کے کسی بھی کونے میں میسر نہیں ہے۔ جانوروں' پرندوں اور آبی حیات کا شکار کیا جاتا ہے' صرف اس لیے کہ شکم میں مردہ گوشت بھرا جا سکے' ایسے میں یہ کہنا ممکن ہی نہیں کہ تم زندگی سے پیار کرتے ہو۔ زندگی انسان کی ہو یا دیگر مخلوقات کی' یکساں طور پر اہم ہے۔ جب تک انسان جانوروں اور پرندوں کے معاملے میں پرتشدد رہے گا اور انہیں امان نہیں دے گا' تب تک وہ اپنی زندگی کے لیے بھی کسی پناہ گاہ کو نہیں پا سکتا۔ اگر تمہیں دوسروں کی زندگی کی پرواہ نہیں تو اپنے لیے کیوں ایسا چاہتے ہو کہ تمہیں تحفظ ملے۔

لوگ شکار کے لیے جاتے ہیں اور معصوم جانوروں کا قتل عام کرتے ہیں۔ میں جام نگر کے راجا کے ہاں مہمان تھا۔ انہوں نے مجھے اپنا محل دکھاتے ہوئے سینکڑوں شیروں اور ہرنوں کے کٹے ہوئے سر بھی دکھائے۔ پورا محل ان ''آرائشی چیزوں'' سے بھرا ہوا تھا اور وہ مجھے

فخر سے بتا رہے تھے کہ "یہ سب جانور میں نے مختلف اوقات میں اپنے ہاتھوں سے موت کی نیند سلائے ہیں۔"

میں نے ان سے پوچھا "لیکن آپ تو مجھے بے حد شریف اور امن پسند آدمی نظر آتے ہیں۔ وجہ کیا تھی؟ کیا ان بھولے بھالے جانوروں نے آپ کو کوئی نقصان پہنچایا تھا؟"

وہ بولے: "ایسا نہیں ہے بلکہ یہ تو ہمارا کھیل ہے۔" میں نے انہیں تصویر کا دوسرا رخ دکھاتے ہوئے کہا:

"اگر شیر حملہ کر کے آپ کو ہلاک کر دے تو کیا یہ واقعہ بھی کھیل ہی کہلائے گا؟ آپ کی بیوی' بچے اور بھائی کیا ان میں سے کسی ایک کی زبان بھی یہ کہے گی کہ یہ تو ہمارا کھیل ہے؟ میرے خیال میں تو آپ کے اہل خانہ اور عزیزوں کی دنیا ہی برباد ہو جائے گی اور وہ دھاڑیں مار کر روتے ہوئے پکاریں گے کہ ہمارا سب کچھ لٹ گیا۔ اگر آپ ماریں تو کھیل ہے اور اگر کوئی آپ کو مارے تو بربادی اور آفت کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ دوہرے معیار انسان کی بے ایمانی اور کم فہمی کو ظاہر کرتے ہیں۔"

یہ سن کر انہوں نے کہا: "میں نے تو کبھی یوں سوچا ہی نہ تھا۔"

لگ بھگ ساری انسانیت گوشت خور ہے۔ لوگ انواع و اقسام کے جانداروں کو موت کے گھاٹ اتارتے ہیں۔ زندگی کے لیے کسی کے دل میں کوئی احترام نہیں رہ گیا۔ جب تک افراد خود کو زندگی کا احترام نہیں سکھاتے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کے لیے درکار ماحول پیدا نہیں کرتے' تب تک وہ اپنی زندگی اور اپنے بنیادی حقوق کے درست مفہوم کا کبھی اندازہ نہیں کر پائیں گے۔

انجمن اقوام متحدہ نے بھی زندگی کو انسان کا اولین بنیادی حقوق قرار دیا ہے لیکن ان کی طرف سے ایسا قرار دینے کا جو مطلب ہے وہ میرے طے کردہ مفاہیم سے مختلف ہے۔ انہوں نے جو نعرہ بلند کیا ہے اسے غلط انداز میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ پوپ' مدر ٹریسا اور ان کی پوری جماعت مانع حمل ادویات اور اسقاط حمل کے خلاف ہیں اور وہ اپنے نظریات کے پرچار کے لیے اقوام متحدہ کی طرف سے یہ کہنے کو ایک حربے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں کہ "زندگی بنیادی انسانی حق ہے۔" انسان کتنا مکار ہے کہ وہ ایک بنیادی انسانی حق کی بات کو بھی اپنے مخصوص مفادات اور خیالات کی ترویج کے سلسلے میں بطور ہتھیار استعمال کر کے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مانع حمل ادویات کا استعمال ایک سنگین جرم ہے کیونکہ ایسا

کرنا زندگی کو ختم کرنے کے برابر ہے اور اسقاط حمل بھی انسانی قتل جیسا ہی مکروہ فعل ہے۔ ان کے نزدیک ایسے حربوں سے جو بچہ پیدا نہیں ہو پاتا' اسے بھی زندگی گزارنے کا اتنا ہی حق حاصل ہوتا ہے جتنا کہ تم اپنے لیے ضروری سمجھتے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی حد قائم کرنے کی ضرورت ہے' لیکن یہ حد کہاں قائم ہوگی؟ نطفے کے درمیان......؟

میرے زاویہ نگاہ سے مانع حمل ادویات کا استعمال کسی بھی بنیادی انسانی حق سے متصادم نہیں ہے۔ بلکہ یہ سرگرمی تو انسانی حقوق کی بازیابی کا عمل بہتر بنانے میں مدد کرتی ہے۔ اگر زمین کے سینے پر انسانوں کی بھیڑ بہت بڑھ جائے تو کروڑوں لوگ قحط سے مر جائیں گے اور جنگوں کے شعلے انسانیت کو بے دردی سے بھسم کر دیں گے۔ کیونکہ جہاں لوگ زیادہ ہوں گے وہاں اختلافات بھی لازماً زیادہ ہوں گے اور مختلف انسانی گروہوں میں اختلافات کا بڑھنا بین الطبقاتی یا بین الاقوامی تصادم کی راہ ہموار کرے گا' یوں جنگیں ہوں گی اور مریں گے کون؟ انسان۔ لہٰذا انسانوں کی کمی' ان کی زیادتی سے بہتر ہے۔ آجکل انسانی آبادی میں جس خوفناک شرح سے اضافہ ہو رہا ہے' اسے دیکھتے ہوئے لگتا ہے کہ انسان جلد ہی غیر انسانی حالت میں مبتلا ہونے والے ہیں۔

بنگال کا بھیانک قحط تو تمہیں یاد ہی ہوگا۔ وہاں مائیں اپنے بچے کھا جاتی تھیں' لوگ اپنی اولادیں فروخت کر رہے تھے' ایک دو روپے میں انسان بکتا تھا۔ یہ ہرگز نہ سوچنا کہ جو لوگ ان مہیب دنوں میں بچے اور عورتیں خرید رہے تھے وہ انسانوں کو خرید رہے تھے۔ نہیں وہ بھی "خوراک" خرید رہے تھے لیکن خریدنے والوں کی بھوک اور بیچنے والوں کی بھوک میں بہت فرق تھا۔ بھوکا بنگالی اپنی عورت یا بچہ ایک وقت کی روٹی کھانے کے لیے بیچتا تھا مگر جو خریدتا تھا وہ بچے کو غلام اور عورت کو داشتہ بنا لیتا تھا۔ اپنی اپنی بھوک ہے نا......کیا بچے پیدا کرنے کی وکالت کرنے والا پوپ اور مدر ٹریسا خود کو ایسے واقعات کا ذمے دار تسلیم کریں گے؟

مانع حمل ادویات کے باعث ماں کے پیٹ میں بچے کا وجود ہی نہیں بن پاتا' لہٰذا بنیادی انسانی حقوق کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اب تو ایسی ادویات مردوں کے لیے بھی دستیاب ہیں' ضروری نہیں کہ عورت ہی کو اس طرح کی تدابیر اختیار کرنے کا مشورہ دیا جائے' مرد بھی اگر چاہیں تو ایسی ادویات کا سہارا لے سکتے ہیں جن کی مدد سے جنسی عمل کے دوران عورت کے حاملہ ہونے کا کوئی احتمال نہیں ہوتا۔ یوں بھی' ایک ایسا بچہ جس نے اپنی نشوونما کا آغاز ہی نہ کیا ہو' اس کے معاملے میں یہ شور و غل کیسے مچایا جا سکتا ہے کہ زندہ رہنا اس کا بنیادی

انسانی حق تھا۔ لیکن یہ مذہبی لوگ ــــ پوپ' مدر ٹریسا' بھارت کے پنڈت' ایران کے خمینی اور دیگر تمام مذاہب کے پیشوا مانع حمل ادویات اور اسقاط حمل کے خلاف ہیں۔ حالانکہ یہ تو ایک چھوٹی سی تدبیر ہے جو انسانیت کو جنگلی اور وحشی ہونے سے بچانے کے عمل میں معاون ثابت ہوسکتی ہے۔ مذہب کے چبوترے پر کھڑے ہوکر انسانیت کی باتیں کرنے والے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکتے کہ جو پیدا نہیں ہو پاتے' ان کی فکر میں تو تم نے اپنی نیندیں حرام کی ہوئی ہیں لیکن جو بے چارے پیدا ہو چکے ہیں ان کے لیے کون سے تارے توڑ لائے ہو؟

میں ضبط تولید کے تمام طریقوں کی مکمل اور پرزور حمایت کرتا ہوں۔ پیدا ہونے سے پہلے بچہ انسان نہیں کہلا سکتا اور ایسا صرف اس کے پیدا ہونے کے بعد ہی کہا جا سکتا ہے کہ اُس کے بھی کچھ حقوق ہیں لیکن اس پر بھی مجھے کچھ اعتراض ہے......

فرض کیا آنے والا بچہ اندھا پیدا ہو' پیدائشی گونگا یا بہرہ ہو تو کیا بعدازاں تم اسے مکمل صحت مند انسان بنانے کے لیے کچھ کر سکتے ہو؟ صرف اس لیے کہ ہم زندگی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے' ایسا بچہ پیدا ہونے کے ستر یا اسّی سال بعد تک مسلسل دکھ اور نفرت برداشت کرتا رہتا ہے۔ کیا یہ انصاف ہے؟ نہیں' یہ عذاب ہے جو تم اُس پر مسلط کر دیتے ہو۔ لہٰذا میرے خیال میں اگر ماں اور باپ رضامند ہوں تو معذور یا اپاہج بچے کو ہمیشہ کی نیند کے حوالے کر دینا چاہیے' اس عمل میں کوئی مشکل یا پیچیدگی نہیں ہے اور نہ ہی رحم دلی پر زد آتی ہے کیونکہ ایسا کرنا بے رحمی نہیں ہے' اصل بے رحمی تو یہ ہے کہ تم ایک اپاہج پیدا کر کے اسے زمانے کی ٹھوکریں کھانے کے لیے تنہا چھوڑ دو اور وہ سالہا سال تمہارے کیے کی سزا بھگتتا رہے' بعض اوقات تو یہ عذاب سو سال سے بھی زیادہ طویل ہو جاتا ہے اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ ''لمحوں نے خطا کی تھی' صدیوں نے سزا پائی۔'' اگر ایک چند روزہ اپاہج بچہ ابدی نیند کے حوالے کر دیا جائے تو گویا ایک سو سالہ مجبور بوڑھا کم ہو گیا' یہ ہرگز بے رحمی نہیں ہے...... اور ویسے بھی میرا ایمان ہے کہ ایسا کرنے سے صرف اور صرف ایک جسم اپنے بنیادی عناصر میں منقسم ہو جاتا ہے اور روح کسی نئے حمل کی سمت پرواز کر جاتی ہے' کوئی نہیں مرتا اور نہ کچھ فنا ہوتا ہے۔

اگر تم حقیقتاً ایک معذور بچے کے لیے اپنے دل میں محبت رکھو گے تو ہرگز یہ نہ چاہو گے کہ وہ زندہ رہ کر اسی' نوے یا سو سال لمبی زندگی دکھ' بیماری اور بڑھاپے کے عذاب سہتا ہوا گزارے۔ اگر پیدا ہونے والا بچہ طبی حوالے سے جسمانی یا ذہنی طور پر نامکمل ہے' آگے جا کر

ایک بہتر زندگی گزارنا اس کے لیے ممکن نہیں اور یہ امید بھی نہیں کہ وہ بڑا ہو کر ایک تندرست آدمی کی طرح اپنے ہوش و حواس سے کام لے سکے گا تو ایسی صورتحال میں بہتر یہی ہے کہ اس کی روح کو جسم سے آزاد کر دیا جائے تاکہ وہ کہیں اور کسی بہتر جسم کے ساتھ پیدا ہو سکے۔

زندگی جیسا بنیادی انسانی حق ایک انتہائی پرپیچ معاملہ ہے اور اس کے تقاضوں میں یہ تقاضا سرفہرست ہے کہ مذہب کے نام پر خونریزی نہ ہو لیکن تاریخ شاہد ہے کہ مذہب کے نام پر خدا کی خوشنودی کے لیے کروڑوں لوگوں کو ہلاکت کی وادی میں دھکیلا گیا۔

یہ حق مطالبہ کرتا ہے کہ سیاسی لوگ اپنی سیاست چمکانے' اقتدار سے چمٹے رہنے اور حکومتوں پر قبضے کی کشمکش میں انسانی جانوں سے نہ کھیلیں۔ لیکن تم دیکھ سکتے ہو کہ عدم تشدد دنیا کے کسی بھی خطے کی سیاست کا وصف نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس سیاسی وجوہات کے سبب دنیا کا نقشہ ہر دور میں سرخ لکیروں سے بھرا رہا ہے اور یہ لکیریں ہمیشہ انسانی خون سے کھینچی گئیں ہیں۔ جوزف اسٹالن جب اقتدار میں تھا تو اس نے دس لاکھ لوگوں کو قتل کیا اور یہ اس کے اپنے لوگ تھے جبکہ ایڈولف ہٹلر نے مجموعی طور پر ساٹھ لاکھ انسان گھروں سے نکال کر قبروں میں پہنچا دیئے۔ یہ تو صرف دو مثالیں ہیں' علاوہ ازیں بھی بہت سے ہٹلر اور اسٹالن پیدا ہوئے' کروڑوں لوگ زندگی سے جبراً موت کی طرف روانہ کیے گئے اور ہزاروں جنگیں لڑی گئیں۔

یوں لگتا ہے کہ سورج کے گرد گھوم رہی زمین پر رہ کر ہم نے صرف ایک ہی کام کیا اور وہ یہ کہ حکمران طبقات کو اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے جنگوں کا اہتمام کرنا پڑا اور سپاہیوں کی ضرورت پڑی تو ہم نے لاتعداد بچے پیدا کرنے کی ٹھان لی اور پھر آج تک مسلسل ہم حکمرانوں کے فوجی ہی پیدا کیے جا رہے ہیں۔ انسانوں کے درمیان جنگیں آج بھی جاری ہیں' فوجیوں کی اب بھی ضرورت ہے لہٰذا ہم اب بھی وہ بچے پیدا کر رہے ہیں جو بڑے ہو کر ہمارے دشمن طبقات کے ''فوجی'' بنیں گے۔ یاد رہے کہ آج یہ ''فوجی'' ہر شعبے میں اپنی خدمات انجام دیتے ہیں کیونکہ جنگ کا روایتی تصور بدل چکا ہے۔ آج زندگی کے ہر میدان میں ایک طاقت کے ''فوجی'' حریف قوت کے ''فوجیوں'' سے برسرپیکار ہیں۔ یہ تصادم زیادہ سے زیادہ افرادی قوت طلب کر رہا ہے لہٰذا ہم پورے خلوص اور لگن سے ''رنگارنگ فوجی'' پیدا کر رہے ہیں اور ہمیشہ سے یہی کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ہم نے ایک مرد کے ایک سے زیادہ عورتوں سے بیاہ رچانے کی رسم بھی ایجاد کی۔ ظاہر ہے' اگر ایک آدمی چھ بیویاں رکھے گا تو ممکن ہے ایک سال بعد ہی چھ بچوں کا باپ بن جائے ......لیکن اس کے

برعکس اگر چھ مرد ایک ہی عورت کے خاوند ہوں تو شاید کچھ بھی نہ ہو اور سب کچھ گڈمڈ ہو کر رہ جائے بلکہ عین ممکن ہے کہ عورت بے چاری نصف درجن خاوندوں کی ''محبت اور توجہ'' کی تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ جائے۔

انسانوں نے جنگی حوالے سے کثیر ازدواجی اور کثیر اولادی کے لیے اتنی زیادہ شعوری کوشش کی ہے کہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ زیادہ سے زیادہ تباہی اور خونریز جنگوں کے آلات کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہیں۔

کیا تم خود کو حقیقی معنوں میں انسان کہلوانے کی تمنا رکھتے ہو؟ تمہارے من میں باہمی توقیر کے ساتھ ایک مثالی معاشرے میں زندگی کا لطف اٹھانے کی خواہش ہے؟ تم روایتی زندگی کی لاش کا بوجھ کندھوں سے اتار کر پھینک دینا چاہتے ہو؟ اور کیا تم ایک فرحت بخش اور رواں دواں جیون کی ضرورت محسوس کرتے ہو؟؟؟؟؟؟ اگر ان سب سوالات کا جواب ''ہاں'' ہے تو پھر آبادی میں کمی ناگزیر ہے۔

یاد رکھو! جب میں کہتا ہوں کہ امن کی ضمانت دینے والی عافیت پسند اور طمانیت بخش زندگی ایک بنیادی انسانی حق ہے تو دراصل میں اس زندگی کی بات کر رہا ہوتا ہوں جو رنگوں سے معمور ہو، روشنیوں سے بھرپور ہو، گیتوں سے بجی ہو اور جسے جینے والے سبھی لوگ اپنے اپنے انداز سے رقصاں ہوں۔

(2) محبت

اگرچہ محبت کو بہت ہی بنیادی انسانی حق کے طور پر تسلیم کیا جانا چاہیے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر سماج کا مرکزی فکری دھارا محبت کا دشمن ہے۔ دنیا میں ہر جگہ محبت کو نیست و نابود کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ جھوٹی معاشرتی اقدار کے نام نہاد پاسبانوں نے شادی کو رواج دے کر پیار کا خاتمہ کر دیا ہے۔ میرے خیال میں بیاہ محبت کا ایک بدنما جھانسہ ہے جو تمہیں صدیوں سے دیا جا رہا ہے۔

ماضی میں چھوٹے چھوٹے بچوں کی شادیاں کر دی جاتی تھیں حالانکہ انہیں کچھ خبر نہ تھی کہ محبت کیا چیز ہے اور شادی کس بلا کا نام ہے۔ کمسن جوڑے ازدواجی بندھن میں کیوں باندھے جاتے تھے؟ اس سوال کا بالکل سیدھا سادا اور آسان جواب یہ ہے کہ سماج کے رکھوالے محبت کی غیر معمولی طاقت سے خوف کھاتے تھے۔ ان کے لیے یہ ناقابل برداشت تھا

بچوں کے مہتابی دلوں سے محبت کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔ وہ محبت کو ذلت و رسوائی کا نام دے کر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ''ممکنہ باغیوں'' کو جوانی کی خودمختار مملکت میں داخل ہونے سے قبل ہی ٹھکانے لگا دینا چاہیے۔ یوں کم عمری کی شادیوں کو رواج دے کر لاتعداد لڑکیوں اور لڑکوں کا باطن ہمیشہ کے لیے محبت کے نور سے محروم کرنے کی دانستہ اور منظم معاشرتی کوشش کی گئی۔ ایسا کرنے والے اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ اگر ایک بار محبت نے ان کی اولادوں کے دل کا دروازہ کھٹکھٹا دیا تو پھر خاندانی اقدار اور اقتدار کا چراغ گل ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔

میں بچوں کی قبل از بلوغت شادی کو ایک غیر انسانی اور انتہائی مذموم فعل تصور کرتا ہوں۔ میرے خیال میں دنیا کے ہر خطے میں بین الفردی تعلقات کی بنیاد ایسے اصولوں پر رکھی جانی چاہیے جن کا منبع محبت ہو۔ دنیا کے ہر لڑکے اور لڑکی کو بلوغت کے بعد دو حقوق لازماً حاصل ہونے چاہئیں:

(1) اپنا جیون ساتھی آزادانہ طور پر منتخب کرنے کا حق اور

(2) آزادانہ طور پر جیون ساتھی بدلنے کا حق۔

یہاں میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ بین الفردی تعلقات میں کسی بھی سطح پر مذہب یا ریاست کی دخل اندازی کباب کی وہ ہڈی ہے جو کسی بھی حوالے سے پسندیدہ قرار نہیں دی جا سکتی۔ یہ دخل اندازی بنیادی انسانی حقوق کے اصل تقاضوں کے منافی ہے لہٰذا اسے فی الفور رکنا چاہیے۔ اس صورتحال پر غور کرو کہ ایک لڑکی کسی لڑکے سے محبت کرتی ہے، لڑکا بھی اسے چاہتا ہے۔ گویا ''دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔'' وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے، ان کی خواہش ہے کہ وہ ایک ہی چھت تلے زندگی گزاریں، ایک ہی بستر پر محوِخواب ہوں اور باہم جنسی تعلقات قائم کریں۔ لیکن جیسے ہی وہ اپنی مشترکہ تمنا کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے ایک دوسرے کی طرف بڑھتے ہیں، مذہب اور ریاست فوراً درمیان میں دیوار کی طرح کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس موقع پر وہ کچھ مطالبے کرتے ہیں جنہیں پورا کرنے کا معاہدہ تحریر کر کے ہی عورت اور مرد ایک بستر تک جا سکتے ہیں۔ یہ تو سراسر بلیک میلنگ ہے۔ ایسا کر کے دو محبت کرنے والوں سے سرکاری، قانونی اور مذہبی ٹیکس وصول لیا جاتا ہے۔ کبھی یہ تاوان پنڈت کی جیب میں جاتا ہے اور کبھی چرچ کے خزانے میں، کبھی مولوی کی مٹھی گرم ہوتی ہے اور کبھی عدالت کی ''کمائی'' میں اضافہ ہوتا ہے۔ عورت اور مرد کے باہمی تعلقات میں

مذہب اور ریاست کا یہ ''درمیانی کردار'' بہت سے مسائل پیدا کرتا ہے۔ میرے خیال میں اس روش کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ایک محبت بھرا تعلق ''شادی'' بن جاتا ہے' محبوبہ ''بیوی'' کا بھیس بدل لیتی ہے اور عاشق ''خاوند'' کا کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ حقیقت ختم ہو جاتی ہے اور اداکاری کا آغاز ہوتا ہے۔ حکمرانوں کو یہ مان لینا چاہیے کہ دو بے تاب برہنہ بدن درمیان میں قوانین اور ضابطوں کو دیکھ کر اداکاری تو کر سکتے ہیں مگر ''محبت'' نہیں۔ میرے نزدیک محبت کے رشتوں میں سماج کو بھی مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ آخر سماج کا کیا نقصان ہوتا ہے؟ صرف دو دل باہم ملتے ہیں اور معاشرے کے ٹھیکیدار آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ دو افراد کے باہمی تعلقات ان کا نجی معاملہ ہیں لہٰذا سماج کو دخل در معقولات سے باز رہنا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر مرد اور عورت اکٹھے رہنا چاہتے ہیں تو انہیں کسی حکومت یا پروہت کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں صرف اپنے دل سے پوچھنا چاہیے' صرف ایک ہی اجازت درکار ہے اور وہ ہے دل کی۔ دل مان لے تو ہر رشتہ جائز ہے۔ ایسے جوڑے اگر کبھی یہ سمجھیں کہ اب اور آگے چلنا ممکن نہیں ہے تو اس معاملے میں بھی انہیں کسی کی اجازت کی قطعاً کوئی محتاجی نہیں ہے۔ کیونکہ ''تعلق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھا۔'' مرد اور عورت جنسی تعلقات ختم کر کے بھی دوستی کو قائم رکھ سکتے ہیں' تم بہت سی خواتین سے محبت بھرا برتاؤ کرتے ہو' لیکن وہ سب تمہاری محبوبائیں تو نہیں ہیں۔ لہٰذا جنسی تعلق باہمی رضا مندی سے ختم کر کے بھی دوست رہا جا سکتا ہے۔ جب جنسی تعلقات کی بنیاد پر استوار تعلق ختم کرنے کو دل چاہے تو دوست رہتے ہوئے اور بیتے ہوئے وقت کی دل خوش کن یادوں کو من میں بسائے ہوئے ایک دوسرے سے جدا ہو جانا چاہیے۔ میں شادی کو بندھن نہیں مانتا' یہ تو ایک مجبوری ہے۔ صرف محبت ہی ایک ایسا بندھن ہے جس کے ذریعے مرد اور عورت ایک دوسرے سے منسلک ہو سکتے ہیں۔ مقدس آگ کے گرد' شادی کے منتر الاپتے ہوئے چکر کاٹنے والوں کو یہ جان لینا چاہیے کہ محبت ایک سیدھا راستہ ہے اور محبت کا تعلق ایسے تمام مصنوعی تکلفات سے بے نیاز ہوتا ہے۔

اس موقع پر کوئی مجھ سے یہ سوال کر سکتا ہے کہ آزادانہ جنسی تعلقات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچوں کی مناسب دیکھ بھال کون کرے گا؟ یہ سوال اس لیے بھی اہم ہے کہ میں باہمی رضامندی کی بنیاد پر جدائی کو بھی درست قرار دیتا ہوں۔

دراصل شادی کے حق میں دی جانے والی دلیلوں میں بھی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ بچوں کا کیا ہوگا؟ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بچوں کے مسئلے کے اور بھی کئی حل ہیں جو بہت مناسب اور عقلی ہیں۔ میں ان لوگوں سے ہرگز متفق نہیں ہوں جو بچوں کو صرف ماں باپ کی ملکیت تصور کرتے ہیں۔ میرے خیال میں انسانوں کے تمام بچوں پر پوری انسانیت کا حق ہے۔ آغاز ہی سے بچوں پر یہ بات واضح کر دینی چاہیے کہ پوری انسانیت تمہاری محافظت کرے گی اور تمہیں سہارا دے گی۔ ماں باپ پر لازم ہے کہ وہ بچوں کو حقیقی صورتحال سے آگاہ کریں اور بتائیں کہ جب تک ہم رضاکارانہ طور پر اکٹھے رہیں گے تب تک تو تمہاری دیکھ بھال کریں گے ہی۔ لیکن اگر کبھی ہمیں باہمی رضامندی سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی تو تب بھی تمہاری حفاظت ہمارے ذمے داری ہوگی اور ہم تمہارا خیال رکھیں گے کیونکہ تم ہمارا خون ہو' ہماری ہڈیوں سے نکلے ہو اور ہماری روح کا درجہ رکھتے ہو۔

ماں باپ کا بچوں کو اپنی ملکیت سمجھنا نہایت خطرناک رجحان ہے جو بدقسمتی سے ہمیشہ قائم رہا ہے اور آج بھی انسانیت اسی خام سوچ میں جکڑی ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے صدیوں پہلے ذاتی ملکیت کے تصور کا آغاز بھی اسی رجحان کے باعث ہوا ہو۔ میرے زاویہ نگاہ سے بچوں کو ذاتی ملکیت سمجھنا درست نہیں' یہ تصور چھوڑ دو اور حقیقت پسند بنو۔ تم بچوں سے محبت کر سکتے ہو' انہیں دعائیں دے سکتے ہو لیکن ان کو اپنی ''جائیداد'' نہیں بنا سکتے کیونکہ وہ تمہارے پاس پوری انسانیت کی امانت ہیں۔ وہ ایک اور دنیا سے تمہاری دنیا میں آتے ہیں اور اس عمل میں تمہاری حیثیت محض دو کمروں کے درمیان لگے دروازے جیسی ہے۔ اسی لیے کہتا ہوں کہ خود کو وہی سمجھو جو تم ہو۔

ہر گاؤں اور قصبے کو بچوں کی حفاظت' دیکھ بھال اور تربیت کا اہتمام اجتماعی طور پر کرنا چاہیے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اگر ایسا ہونے لگے تو ''شادی'' کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ جس فضول اور بے معنی رسم کو تم ''شادی'' کہتے ہو' یہ محبت کرنے کے بنیادی انسانی حق کی بربادی کا نام ہے۔

اگر محبت کو ''شادی'' کی جیل سے رہائی مل جائے تو رنگ اور نسل کی بنیاد پر سر اٹھانے والے تمام اختلافات خود بخود ختم ہو جائیں گے کیونکہ محبت ایسی تمام بدصورت حدود و قیود اور تعصبات سے آزاد ہوتی ہے۔ جس طرح سفید رنگ والے کو چاہنے کے معاملے میں تم بااختیار ہو' اسی طرح تمہیں ایک سیاہ فام سے پیار کرنے کی بھی آزادی ہونی چاہیے۔ محبت

مذہبی تعلیمات کی پابندی کو بھی تسلیم نہیں کرتی اور نہ ہی محبت کرنے والے کسی جذباتی واعظ کی باتیں سنتے ہیں کیونکہ ان کے کان تو صرف دل کی دھڑکنوں کی صداؤں پر لگے ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ محبت سماجی' ریاستی اور مذہبی پابندیوں سے آزاد ہوگئی تو دیگر غصب شدہ انسانی حقوق کی بازیابی کا عمل بھی تیزی سے شروع ہوجائے گا۔

طبی ماہرین کہتے ہیں کہ وراثتی طور پر مختلف جسمانی اور ذہنی خصوصیات رکھنے والے جوڑوں کے بچے انتہائی تندرست' توانا اور ذہین ہوتے ہیں۔ یہ بات آج ہم سب کو معلوم ہے کہ دنیا بھر میں جانوروں کی نسل کے حوالے سے مختلف قسم کے تولیدی تجربات کیے گئے ہیں۔ اس قسم کے تجربات کامیاب رہے اور ان کے ذریعے اچھے گھوڑے' اچھے کتے اور اعلیٰ نسل کی گائیں' بھیڑیں اور بھینسیں پیدا کرنے میں کامیابی ملی۔ اس کامیابی کی کلید یہی تھی کہ مختلف وراثتی خصوصیات کے حامل جوڑوں کا ملاپ کرایا گیا اور نتیجتاً ''مثالی اولاد'' پیدا ہوئی۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں لیکن تم ''مثالی اولاد'' کے حصول کا واحد طریقہ عملی طور پر اپنانے کے لیے شاید ابھی تک تیار نہیں ہوسکے ہو۔

آج تمام شاہی خاندانوں میں بے چینی اور عدم اطمینان پھیلا ہوا ہے۔ ان لوگوں کے پاس دنیا جہاں کی نعمتیں ہیں لیکن اس کے باوجود وہ دکھی ہیں۔ مختلف سروے رپورٹوں سے بھی یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ دنیا بھر میں شاہی خاندانوں میں پیدا ہونے والے افراد ذہنی صلاحیتوں میں بہت کمتر ہوتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ وہ شاہی خاندان کے لڑکے کی شادی صرف شاہی خاندان ہی میں کرنے کی روایت پر کاربند ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ اگر ''شاہی خون'' میں ''عام خون'' کی ملاوٹ ہوگئی تو شاید قیامت برپا ہوجائے' زمین پھٹ پڑے یا آسمان گر پڑے۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج کے جدید دور میں بھی ہم ''شاہی خون'' جیسے الفاظ کی حرمت اور تقدس پر غور وفکر کرتے ہیں۔ تمہیں آج نہیں تو کل' یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ خون شاہی ہوتا ہے نہ غیرشاہی' خون صرف خون ہوتا ہے۔ اگر دس بارہ خاندان آپس ہی میں شادیاں کرتے رہیں تو بہت سی بیماریوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔

آپس میں شادیاں کرنے والے خاندانوں کے بچے احمق ہوتے ہیں اور کم عقلی یا حماقت ایک بیماری ہے۔ پرنس آف ویلز کی تصویر کو غور سے دیکھنا' تمہیں دیکھتے ہی اندازہ ہوجائے گا کہ احمق آدمی سے میری کیا مراد ہے۔ دنیا بھر میں موجود شاہی خاندانوں کے افراد بھی اب اس یکسانیت سے گھبرا اٹھے ہیں لیکن وہ اپنے محدود سے گھیرے کو توڑنے کی جرأت

نہیں کرسکتے۔ آج تک مجھے شاہی خاندانوں کا ایک بھی فرد ایسا نہیں ملا جو عقل مند کہلا سکتا ہو۔ بھارت کے کبھی راجوں' مہاراجوں کے خاندانوں سے میرے تعلقات رہے ہیں اور میں وثوق سے کہتا ہوں کہ ''شاہی خون'' کی پاسداری کی روایت نے نہ صرف انہیں ذہنی نشوونما کی درکار سطح سے نیچے گرادیا ہے بلکہ جسمانی طور پر بھی وہ اپنا بہت کچھ گنوا بیٹھے ہیں۔

تم نے راسپوٹین کا نام تو ضرور سنا ہوگا۔ انقلاب روس سے پہلے وہ وہاں کا سب سے اہم آدمی خیال کیا جاتا تھا اور اس کی اہمیت کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ وہ روسی شاہی خاندان کا محسن تھا۔ قصہ یہ ہے کہ زار روس کا بیٹا ایک خطرناک بیماری میں مبتلا تھا' جب اسے کوئی زخم آتا تو خون کا بہاؤ رکے نہ رکتا۔ وہ لوگ قابل سے قابل معالج طلب کرتے' اعلیٰ سے اعلیٰ ادویات منگواتے لیکن زخم سے خون کا اخراج کئی کئی دن تک جاری رہتا۔ یہ ''شاہی خون'' کے ''شاہی خون'' سے ملاپ ہی کا نتیجہ تھا۔ جہاں تک راسپوٹین کا تعلق ہے تو وہ صاحب تدبیر ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو متاثر کرنے کی غیرمعمولی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔ بہت سے لوگوں نے اس کے بارے میں بہت کچھ کہا اور لکھا ہے۔ لیکن میرے خیال میں نہ وہ بھگت کہلا سکتا ہے اور نہ ہی اسے پاپی قرار دینا چاہیے۔ وہ صرف اور صرف ایک ذہین آدمی تھا جو دوسروں کو ایک معمول کی طرح بے بس کرکے اپنے کہے پر عمل پیرا کردینے کی بھرپور اہلیت کا حامل تھا۔ وہ اپنی شخصیت اور چرب بیانی کے زور پر دوسروں کو مسحور کردینے کا فن خوب جانتا تھا اور اپنے انہی شخصی اوصاف سے مدد لیتے ہوئے زار روس کے بیٹے کے زخم سے بہتا ہوا خون بھی روک لیا کرتا تھا۔ یہ کام ڈاکٹر کرسکتے تھے نہ ادویات۔ صرف ایک راسپوٹین ہی تھا جس کی قربت اور گفتگو سے روس کا ولی عہد بے پناہ خوشی محسوس کرتا اور ایسے لمحات میں یوں محسوس ہوتا کہ جیسے یہ لڑکا کبھی بیمار ہی نہ ہوا ہو۔ یوں راسپوٹین روس کے شاہی خاندان کے لیے ناگزیر ہوگیا۔

بہرحال' میں تمہیں یہ بتا رہا تھا کہ آپس ہی میں شادیاں رچاتے رہنے کی عادت نے شاہی خاندانوں کے افراد کو ذہنی طور پر بھی متاثر کیا ہے اور جسمانی طور پر بھی۔

شاہی خاندانوں کی لڑکیاں ''اعلیٰ خون'' میں ''گھٹیا خون'' شامل نہ ہونے کے باعث اپنی خوبصورتی کھورہی ہیں۔ ماضی بعید کی شہزادی ماضی قریب کی شہزادی سے خوبصورت ہوا کرتی تھی۔ آج کل کی نام نہاد شہزادیاں شاید اپنے جسمانی نقائص سے آگاہ ہیں' ورنہ وہ ضرور حسن کے عالمی مقابلوں میں بلامقابلہ کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کرتیں۔ کبھی تم نے

سنا ہے کہ شاہی خاندان کی کسی لڑکی کے عالمی ملکۂ حسن ہونے کا اعلان کیا گیا ہو؟ انگلینڈ کی ملکۂ عالیہ کو ایک خوبصورت خاتون تصور کرنا اپنے ذہن کی معقول فضا کو خوامخواہ آلودہ کرنے والی بات ہے۔ کیا تم ایسا سوچ سکتے ہو؟

انگلستان بھر میں ایک افواہ عام ہے' مجھے نہیں معلوم کہ اس میں سچائی کتنی ہے اور جھوٹ کتنا۔ میں نے تو لفظ ''افواہ'' بھی اسی لیے برتا ہے کہ مجھ پر کوئی ذمہ داری نہ ڈال دی جائے۔ بہر حال' دروغ بر گردنِ راوی' جس افواہ کی میں بات کر رہا ہوں اُسے حقیقت سمجھنے والے ملکہ ایلزبتھ کے خاوند پرنس فلپ کی ''مخصوص کمزوریوں'' کو ہاتھ پر ہاتھ مار کر بیان کرتے ہیں۔ لیکن مجھے تو پرنس فلپ پر رحم آتا ہے اور اگر سچ پوچھو تو ملکہ ایلزبتھ جیسی عورت سے جو بھی شادی کرتا اس کا یہی حشر ہوتا۔ لہٰذا انگریزوں کو چاہیے کہ وہ اس معاملہ کو دنیا کا آٹھواں عجوبہ نہ سمجھیں' یہ تو ایک معمولی بات ہے۔

انگلستان کے شاہی خاندان کا ذکر چل ہی نکلا ہے تو یہ بھی سن لو کہ دو تین ہفتے قبل شہزادہ چارلس کا ایک ذاتی محافظ ایڈز کا شکار ہونے کی وجہ سے مر گیا۔ مرنے والے کو یہ تحفہ آسمان سے تو یقیناً نہیں ملا تھا' یہ جس بھی ''مقدس بھوت'' یا ''پاکیزہ روح'' کی کارستانی تھی وہ اب بھی شاہی خاندان میں ہی ہوگا۔ لیکن کون ہے وہ؟ اس سوال کا جواب کوئی نہیں جانتا۔ ایک مخصوص حلقے میں صرف ایک ہی آدمی ایڈز جیسے مرض کا شکار ہو' یہ ممکن نہیں ہے' لہٰذا مستقبل میں شاید کچھ اور لوگ بھی موت کا شکار ہوں گے' کیونکہ یہ سلسلہ چل نکلے تو بہت دور تک جاتا ہے۔ بہر حال مجھے ''شاہی خون'' کو خالص رکھنے کے دعویداروں کے ذاتی محافظ کی ایڈز سے موت پر بہت دکھ ہوا۔

شاہی خاندان کے لوگ شاہی خاندان ہی میں شادیاں کریں' ہندو کی شادی ہندو ہی سے ہو اور برہمن کا بیاہ برہمن ہی سے رچایا جائے' یہ تمام پابندیاں مصنوعی اور غیر ضروری ہیں' میں سمجھتا ہوں کہ ایسی کوئی حد مقرر نہیں کی جانی چاہیے۔ بلکہ میں تو یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ کوئی ایسا قانون بنایا جائے جس کی رو سے ایک بھارتی شہری کو بھارتی شہریت کے حامل کسی دوسرے فرد سے شادی کی اجازت ہی نہ ہو۔ میں تو کہتا ہوں کہ جاؤ' سات سمندر پار آباد لوگوں میں سے اپنا جیون ساتھی تلاش کرو' میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ایسا کر کے تم صحت مند' ذہین اور لمبی عمر والی اولاد پیدا کر سکو گے۔ لیکن یہ تبھی ممکن ہے جب شادی کو ''طلاق'' دے دی جائے اور اُس محبت کو عالمگیر احترام ملے جو آج دنیا بھر میں قابل مذمت سمجھی جاتی ہے۔

(3) موت

زندگی اور محبت کے بعد تیسرا اہم ترین انسانی حق موت ہے۔ ایک خاص عمر گزر جانے پر جب کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ وہ بھر پور انداز میں زندگی بسر کرنے کے بعد اب صرف موت ہی کا انتظار کر رہا ہے تو اسے یہ بنیادی حق حاصل ہونا چاہیے کہ اپنی مرضی سے جسم و جاں کا تعلق ختم کر ڈالے۔ موت کا انتظار کرنے اور بے کیف زندگی کا بوجھ احمق گدھے کی طرح اٹھائے رکھنے سے کیا حاصل۔ اپنے ''آج'' کو اذیت ناک کیوں بنایا جائے۔ یاد رکھو! آنے والے ''کل'' میں تمہارے ''آج'' ہی کی دوبارہ واپسی ہوگی۔

جس طرح ہر انسان کو زندہ رہنے کا حق ہے' بالکل اسی طرح ہر انسان کو زندہ نہ رہنے کا بھی حق ہے۔ ہر کسی کی زندگی اس کی اپنی زندگی ہے۔ اگر کوئی آدمی اپنی مرضی سے مزید جینے کو مناسب نہ سمجھے تو کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اسے جینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے کیونکہ ایسی ہر کوشش بجائے خود بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے زمرے میں آتی ہے۔

ہر ہسپتال میں ایک ایسا کمرہ تعمیر کیا جانا چاہیے' جہاں مرنے کا تمنائی اپنی موت کے خود مقرر کردہ دن سے ایک مہینہ قبل آ کر مقیم ہو جائے۔ کمرے میں آنے کے بعد اس کی ہر خواہش پوری کی جانی چاہیے۔ ایسے شخص کو ہر وہ چیز فراہم کرنی چاہیے جس کے بارے میں وہ زندگی بھر سوچتا رہا' لیکن اسے حاصل نہ کر سکا۔ ادب سے مصوری اور مصوری سے موسیقی تک مرنے کے خواہشمند کے ہر ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرنا ضروری ہوگا۔

موت کے مسافر اور زندگی کے مہمان کے کمرے میں متعلقہ ہسپتال کے معالج بھی آئیں اور وہ اسے بتائیں کہ کس طرح پرسکون رہا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے اب تک موت ایک بدصورت اور ناپسندیدہ چیز رہی ہے۔ لیکن تم اسے ایک تہوار میں بھی بدل سکتے ہو بشرطیکہ اس کے استقبال کا فن سیکھ جاؤ ... ستانے اور مطمئن رہنے کے سے انداز میں موت کا خیر مقدم کرو تو یہ ایک تہوار کی صورت اختیار کرے گی۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو پھر موت کو کبھی یہ موقع نہیں ملے گا کہ تمہیں شکار سمجھ کر شکاری درندے کی طرح حملہ آور ہو جائے۔

ہسپتال کے خصوصی کمرے کے مقیم کو وہ سب لوگ آ کر مل سکتے ہیں جو خود کو اس کا ہمدرد' دوست اور مددگار خیال کرتے ہوں۔ یہ ملاقاتیں پورا مہینہ جاری رہنی چاہئیں۔ اس

عرصے میں تفریحی تقریبات کا انعقاد بھی کیا جا سکتا ہے۔ ہسپتال کی انتظامیہ کا فرض ہوگا کہ وہ پورا مہینہ موت کے تمنائی کے لیے ہر سہولت کا اہتمام کرے۔ اس امر کو یقینی بنانا ہوگا کہ موت کی طرف سفر کرنے والے کی زندگی کا آخری مہینہ بادشاہوں کی طرح گزرے تاکہ وہ کسی ادھوری خواہش کی چبھن دل پر محسوس کیے بغیر زندہ لوگوں کی دنیا سے رخصت ہو۔ اگر ایسا ہوجائے تو جانے والے کے دل میں شکرگزاری کے جذبات پیدا ہوں گے اور وہ اپنے گہرے دکھ دور کرنے پر زندوں کی دنیا کو مہربان دنیا تصور کرے گا۔ اب تک ہم غلط راستوں کا انتخاب کرکے اپنا سفر لمبا کرتے رہے ہیں لہٰذا موت کے لیے یہ اہتمام لازماً کیا جانا چاہیے۔

(4) سچائی کی جستجو

بچوں پر کسی خاص مذہب یا فرقے کی تعلیمات اور رسوم و رواج کو مسلط نہیں کرنا چاہیے۔ تم بالغ' جوان اور بوڑھے ہونے تک اپنا یہ حق کھو چکے ہو جسے میں سچائی کی جستجو کہتا ہوں لیکن آنے والی نسل کو اس حق سے محروم نہ کرو۔ بچوں پر ذاتی یا آبائی تصورات و افکار اپنانے کے لیے دباؤ ڈال کر دراصل تم ان کے ذوق تحقیق کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہو۔ ماں باپ کی حیثیت سے اپنا یہ مجرمانہ کردار ترک کرکے سیدھے راستے پر آؤ اور بچوں کے مزاج میں جستجو کی صلاحیت کو مزید نکھارو۔ سچائی کی جستجو بھی بنیادی انسانی حق ہے۔ اپنے بچوں کو یہ حق لازماً دو تاکہ وہ شک کرنے کے قابل ہوسکیں۔ شک یقین کی علت ہے اور سچائی تک رسائی کا واحد راستہ۔ جب تک شک بیدار نہیں ہوگا تب تک یقین کی منزل نہیں آسکتی۔ بچوں کو بتاؤ کہ تمہارے چاروں طرف بسنے والے لوگ اوہام میں گرفتار ہیں' انہیں جیسے نہ بنو۔ پہلے سے رائج اعتقادات کو آنکھیں بند کرکے قبول کرنے کا درس دینا ننھے منے ذہنوں کو آلودہ کرنے کے مترادف ہے۔ اپنے نونہالوں سے کہہ دو کہ وہ سنی سنائی باتوں پر اندھادھند ایمان لانے کی بجائے مزید معلومات کی سعی کریں۔ انہیں آگاہ کرو کہ سچائی کی جستجو لازمی ہے' خود کو اس کے لیے وقف کردو۔ قیمت ادا کرو' سالہا سال اپنی لگن میں لگے رہو' کسی کا سہارا نہ لیتے ہوئے صرف اپنے بل بوتے پر سچ کو تلاش کرو کیونکہ اسی میں تمہاری بہتری ہے۔

کروڑوں ایسے لوگ جو سوچتے ہیں کہ ہم عیسائی ہیں' جو سوچتے ہیں کہ ہم یہودی ہیں' جو سوچتے ہیں کہ ہم ہندو ہیں اور جو سوچتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں ... یہ سب لوگ ایسے خوش عقیدہ ہیں کہ ہر بات کو بلا سوچے سمجھے اختیار کرلیتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ

اندھی تقلید خالص زہر کا درجہ رکھتی ہے
اور علم تمہاری ابتداء کا عروج ہے۔

اپنے آپ میں اور دوسروں میں سچائی کی جستجو کو ترقی دو' یہی تمہارا فرض ہے۔ بعض لوگ دوسروں کو یہ سکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ سچ کیا ہے' اور وہ اکثر ناکام ہوتے ہیں کیونکہ وہ غلط سرگرمی میں مصروف ہوتے ہیں۔ میں انہیں مشورہ دوں گا کہ دوسروں کو سچائی کی جستجو کرنا سکھاؤ' سچ نہ سکھاؤ کیونکہ سچ سکھایا نہیں جا سکتا۔ سچائی کی جستجو بہت مشکل ہے' اس کی نسبت ایک خوشنما عقیدے کو مان لینا بہت آسان ہے۔ سچ سستا نہیں ہے' اس کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے لیکن یہ بھی ذہن میں رکھو کہ سچ اس دنیا کی سب سے قیمتی جاگیر ہے۔ سچ کی دولت تم کسی سے ہتھیا نہیں سکتے کیونکہ یہ صرف ذاتی کوشش سے ہاتھ آتی ہے اور ایک شخص سے دوسرے تک منتقل نہیں ہوسکتی۔

یہ کس قدر معجزاتی حقیقت ہے کہ جب تم خود سے یہ پختہ عہد کرتے ہو کہ میں اب کبھی بھی آنکھیں بند کرکے یقین نہیں کروں گا تو سچائی کی طرف تمہارا آدھا سفر اسی لمحے تمام ہوجاتا ہے۔ اگر تمہارا تصور اور تخیل مضبوط ہے تو باقی راستہ بھی طے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ایسی صورت میں سچ خود تمہارے پاس آجاتا ہے۔ اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے تمہیں صرف خاموش ہونا پڑتا ہے' تمہیں مہمان نوازی کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے تاکہ سچائی ہمیشہ کے لیے تمہارے باطن میں چلی آئے۔

ابھی پوری دنیا انواع و اقسام کے عقائد میں جکڑی ہوئی ہے' اسی لیے لوگوں کی آنکھوں میں سچائی سے آشنائی کی چمک نظر نہیں آتی' ان کے قول و فعل میں انسانی عظمت کا کوئی سراغ نہیں ملتا' ان کی زبانوں سے ادا ہونے والے الفاظ کھوکھلے اور معنوی گہرائی سے محروم ہیں۔ عقیدہ ہمیشہ کھوکھلا ہوتا ہے جبکہ سچ ٹھوس حقائق کی نمائندگی کرتا ہے۔ عقیدہ اپنانا ریت کا محل بنانے کے برابر ہے اور ریت کے محل ہوا کے ایک ہی جھونکے سے دوبارہ ریت ہوجایا کرتے ہیں۔ سچائی لافانی ہے اور اسے حاصل کرکے تم بھی اس کی لافانیت کا حصہ بن جاتے ہو۔ اسی لیے میں سچائی کی جستجو کو اہم ترین بنیادی انسانی حقوق میں شمار کرتا ہوں۔

(5) دھیان (مراقبہ)

سچائی کی جستجو کے لیے دھیان یا مراقبہ کلیدی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا ابتدائی تعلیم دیتے

والے اداروں سے لیکر اعلیٰ ترین یونیورسٹیوں تک ہر ادارے میں ایسا طمانیت بخش ماحول پیدا کیا جائے جو دھیان میں مصروف طالب علموں کے ارتکاز توجہ میں معاون ثابت ہو۔ میں دھیان یا مراقبے کو بھی انسان کا ایک بنیادی حق تصور کرتا ہوں کیونکہ یہ خود آگاہی پیدا کرتا ہے۔ واضح رہے کہ دھیان کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتا کیونکہ یہ تو باطنی دنیا کا ایک خالص علم ہے۔

مراقبے کے لیے خاموشی کی تربیت' چوکسی اور مشاہدے کی تربیت اور اس بات کی تربیت کی تم باطن کی دنیا سے بھی اُس پار کے جہان کی چیز ہو' تمہیں سچائی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار کرتی ہے لہٰذا ایسی ہمہ جہت تربیت بھی ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔

یہ سچائی ہی ہے جسے کچھ لوگ ایشور (قادرِ مطلق) قرار دیتے ہیں اور کچھ نروان (نجات) کہتے ہیں' اس کے علاوہ بھی سچائی کے بہت سے نام رکھے گئے ہیں لیکن وہ تو ایک بے نام سناٹا ہے۔ بے لفظ خاموشی ہے۔ طمانیت ہے اور ایسی گہری طمانیت کہ تم سرتاپا اس میں ڈوب کر رہ جاتے ہو۔ جس لمحے تم سچائی میں گم ہو جاؤ' جان لو کہ یہ وہی لمحہ ہے جب تم پرماتما (روحِ برتر) کے مندر میں داخل ہو رہے ہوتے ہو۔

بہت حیرانی کی بات ہے کہ لوگ طمانیت سے آشنا ہوئے بغیر' مطمئن ہونے کا فن سیکھے بغیر یا خود آگاہی سے بے نیاز ہو کر اپنی زندگی کا ایک تہائی حصہ بڑے بڑے تعلیمی اداروں میں برباد کر دیتے ہیں۔ وہ جدید ترین علوم سیکھتے ہیں اور کرۂ ارض پر آباد ممالک کے بارے میں تازہ ترین واقعات سے باخبر رہتے ہیں۔ لیکن انہیں اپنے آپ کی کوئی خبر نہیں ہے' وہ سب کچھ جانتے ہیں مگر خود سے انجان ہیں۔ ان کی آنکھیں اپنے آپ کے علاوہ باقی سب کچھ دیکھ لیتی ہیں۔ ایسے جاہل عالموں کی بھرمار ہے جو سمندر کی تہہ میں جا کر بھی پیاسے ہی رہتے ہیں۔ ان کی مثال ایسے چاولوں کی طرح ہے جو بہت شوق اور محنت سے پکائے جائیں لیکن ایک آنچ کی کمی سے کچے اور بدذائقہ رہ جائیں۔ ایسے لوگوں کو دانا و بینا کہا جاتا ہے لیکن میرے نزدیک وہ احمق اور اندھے ہیں۔

بھارت میں ایک قدیم کہانی بہت مقبول ہے۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ دس اندھے آدمی سفر پر نکلتے ہیں۔ انہیں ایک سے دوسرے گاؤں تک جانا ہے اور درمیان میں ایک ندی بہتی ہے۔ ندی گہری نہیں ہے لیکن پانی کا بہاؤ اس قدر تیز ہے کہ دور ہی سے اس کی سانپ جیسی پھنکار واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔ تمام اندھے ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر

ندی میں اترتے ہیں اور انتہائی احتیاط سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے کامیابی سے دوسری طرف جا نکلتے ہیں۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر ایک اندھا کہتا ہے

"ٹھہرو ہم اپنی گنتی کر لیں' پانی کا بہاؤ خطرناک حد تک تیز تھا' کہیں ہمارا کوئی ساتھی پاؤں اکھڑ جانے کے سبب منہ زور ریلوں ہی میں نہ بہہ گیا ہو۔" ایک دو آوازیں اس کی تائید میں بلند ہوتی ہیں اور گنتی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ پہلے گنتی کا مشورہ دینے والا خود گنتی کرتا ہے' بعد میں دوسرا اور پھر تیسرا۔ لیکن ہر بار ان کی پریشانی بڑھتی ہی جاتی ہے کیونکہ گنتی دس تک پہنچنے کی بجائے نو پر ہی رک جاتی ہے جبکہ گاؤں سے چلتے وقت اندھوں کی مجموعی تعداد دس تھی۔ اس پر انہیں یقین ہو گیا کہ ایک اندھا ندی پار کرتے ہوئے پانی کے تند ریلوں میں بہہ گیا ہے۔ اب انہیں سفر کی ہوش کہاں رہتی' وہیں کنارے پر بیٹھ گئے اور لگے آہ و زاری کرنے۔ کچھ ہی دور ایک آدمی کافی دیر سے اندھوں کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر رہا تھا اور چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا کہ بار بار چھوٹتے ہنسی کے فواروں کو بہت مشکل سے ضبط کرنے کی کوشش میں ہے۔ جب اندھوں کا رونا پیٹنا عروج پر پہنچ گیا تو وہ ان کے پاس آیا اور پوچھنے لگا:

"آخر بات کیا ہے؟ کیوں رو رہے ہو۔"

"ندی کے ظالم پانی کی تیزی ہمارا ایک پرانا دوست کھا گئی ہے' ہائے' اس کی بجائے میں بہہ گیا ہوتا۔" ایک اندھے نے کہا اور بعد میں دیگر تفصیل بھی بیان کی تو نووارد نے ایک بار پھر بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی اور بولا:

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں' تمہارا دوست لوٹ آئے گا۔ تم سب قطار بنا لو' اب تمہاری گنتی میں کروں گا۔ طریقہ یہ ہوگا کہ قطار میں جو سب سے پہلے بیٹھا ہوگا میں اس کے سر اپنا جوتا ایک بار ماروں گا اور وہ زور سے چلا کر کہے گا: ایک۔ دوسرے کو دو جوتے پڑیں گے اور وہ با آواز بلند "دو" پکارے گا' اسی طرح تیسرا اندھا تین جوتے برداشت کر کے "تین" کی صدا دے گا اور یہ سلسلہ یونہی آگے بڑھتا رہے گا۔"

مزے کی بات یہ ہے کہ جوتے مارنے والا گنتی کو دس تک لے جانے میں کامیاب ہو گیا کیونکہ وہ دور کھڑا دیکھ رہا تھا کہ جو اندھا بھی گنتی شروع کرتا ہے وہ اپنے آپ کو شمار ہی نہیں کرتا لہٰذا ہر بار گنتی نو پر رک جاتی تھی۔ اندھوں نے اپنا دسواں ساتھی مل جانے کی خوشی میں جوتے مارنے والے کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا' انہوں نے اس کے پاؤں

چھوئے اور کہا کہ آپ ہمارے لیے پرماتما کے برابر ہیں۔ ہم سب کو پورا یقین ہے کہ ہمارا ایک ساتھی کم ہوگیا تھا۔ کیا آپ بتانا پسند فرمائیں گے کہ گمشدہ اندھا اچانک کیسے ظاہر ہوگیا۔''

وہ آدمی بولا: ''یہ ایک خفیہ راز ہے جو تم کبھی نہیں جان سکتے لہٰذا اپنی راہ لو اور میرا دماغ چاٹنے سے باز رہو۔'' اندھوں نے کہا: ''جو حکم سرکار'' اور دوبارہ پاؤں چھو کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔

اس کہانی میں اندھوں کی گنتی پوری کرنے والے آدمی نے جس ''خفیہ راز'' کا ذکر کیا ہے' وہ ہے اپنے آپ کو بھول جانا۔ یہ انسان کی پرانی عادت ہے۔ اکثر اوقات ہم پوری زندگی ہی خود فراموشی میں ضائع کر دیتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان سب کچھ جانتا ہے' ہر چیز کا مشاہدہ کرتا ہے لیکن اپنی ذات تک اس کی نظر نہیں جاتی۔ اس حوالے سے وہ بھی اپنے آباؤاجداد کی طرح خود فراموش ہی واقع ہوا ہے۔

دھیان یا مراقبہ ایک واحد تربیت ہے جس کی مدد سے تم گنتی کا آغاز خود اپنی ذات سے کرنے کے قابل ہوتے ہو: ایک......

مراقبہ چونکہ کسی مذہب کی ملکیت نہیں لہٰذا اسے اختیار کرنے میں کسی بھی طرح کے پیچیدہ مسائل حائل نہیں ہوتے۔ دنیا کے ہر سکول' ہر کالج اور ہر یونیورسٹی میں اس بنیادی انسانی حق کی تربیت کا اہتمام ہونا چاہیے تاکہ دنیوی علوم کے ساتھ ساتھ طالب علموں کو اپنی ذات کے بارے میں بھی آگاہی حاصل ہو سکے۔ ایسا ہوگیا تو تعلیمی اداروں سے گھر کی طرف لوٹتے طالب علموں کی ذہنی حالت کبھی منتشر نہیں ہوگی۔ نوجوان نسل کے نمائندوں کے اردگرد مراقبے کا حفاظتی اور طمانیت بخش ہالہ ہونا چاہیے ورنہ تعلیمی ادارے سے گھر کو لوٹتے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں کے پاس سوائے کچرے کے اور کچھ نہ ہوگا۔ وہ صرف دماغوں میں کوڑا کرکٹ بھر رہے ہیں۔ وہ جغرافیہ پڑھتے ہیں' حساب اور سائنس کی تعلیم پاتے ہیں' ہزاروں میل دور واقع شہروں کا محل وقوع بیان کر سکتے ہیں اور جدید ترین ایجادات کے حوالے سے گفتگو کرنے میں ماہر ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے وہ یہ نہیں جانتے کہ ہم کون ہیں' کہاں ہیں اور کیوں ہیں؟

تمہاری زندگی میں آگاہی کا محور و مرکز صرف یہ ہے کہ تم کون ہو اور کہاں ہو؟ جب تم اس سمت میں پہلا قدم آگے بڑھاتے ہو تو باطنی دنیا کی دھند سورج کی راحت بخش

کرنوں سے ختم ہونے لگتی ہے۔ مناظر صاف ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور اپنی ذات کی طرف اپنی ہی نگاہیں درست زاویے اور خالص نیت سے اٹھتی ہیں۔ آج ہم سے خود آگاہی کا حق بھی غیر محسوس طور پر چھین لیا گیا ہے لیکن ہم اس حق کی بازیابی کا عہد کریں تو اگلے ہی لمحے دوبارہ دھیان کی دنیا میں پاؤں رکھ سکتے ہیں۔

(6) ہمہ جہت آزادی

ہم پرندوں اور جانوروں جتنے بھی آزاد نہیں ہیں۔ کیا تم نے کبھی کسی پرندے کو پاسپورٹ بنوانے کے لیے سرکاری دفتروں کے چکر کاٹتے دیکھا ہے؟ وہ جب چاہے بغیر کسی مداخلت کے پاکستان جا سکتا ہے' اسے وہاں داخلے کے لیے کسی ویزے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ حیرت یہ ہے کہ تمام جانداروں میں سے صرف انسان ہی ایک ایسا جاندار ہے جو ایسی تمام پابندیوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور اس کے باوجود بھی آزادی کے جشن مناتا ہے۔ شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ''رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے۔'' بھارت ایک وسیع و عریض ملک ہے' اسی وجہ سے تم بھول جاتے ہو کہ تمہیں ایک قید خانے میں رکھا گیا ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ تم اپنی مرضی سے آزادانہ طور پر نہ بھارت سے باہر جا سکتے ہو اور نہ کوئی تمہیں ملنے کے لیے آسانی سے بھارت میں داخل ہو سکتا ہے۔ تم بھارت کو صرف اس لیے جیل خانہ نہیں کہتے کہ یہ رقبے میں بہت بڑا ہے۔ ایک بھارت ہی پر موقوف نہیں بلکہ پوری دھرتی ایسے قید خانوں سے بھری ہوئی ہے جنہیں عام طور پر ملک یا وطن کہا جاتا ہے۔

ہمہ جہت آزادی اہم ترین انسانی حقوق میں شامل ہے اور اس کی رو سے دنیا کے ہر خطے کا ہر انسان مجموعی انسانیت کا تشکیل کنندہ اور حصہ ہے۔

ریاستوں کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ' مذاہب کو بھی ہمیشہ کے لیے ٹھکانے لگا دینا چاہیے کیونکہ یہ دونوں ہی غلامی کے قیام اور استحکام کا باعث بنتے ہیں۔ انسانوں کی ہمہ جہت آزادی نہ مذہب کے مفاد میں ہے نہ ریاست کے لیے قابل قبول۔ دنیا بھر کے مذہبی اور سیاسی رہنماؤں کی تمام کوششوں کا مرکز یہی مقصد ہوتا ہے کہ انسانوں کو تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزار کر ایک دوسرے کے ساتھ برسرپیکار رکھا جائے تاکہ وہ یکجا ہو کر اپنی آزادی کی جنگ نہ لڑ سکیں۔ لگ بھگ تمام ممالک میں مختلف الخیال سیاسی پارٹیاں اور ہر مذہب میں موجود بلاجواز فرقے بندی اسی سازش کی کڑیاں ہیں۔ مذہبی فرقوں کے حوالے سے یہاں میں ایک

دلچسپ واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں جس میں تمہارے لیے نصیحت و عبرت کے بہت سے پہلو موجود ہیں:

میں تمہارے مہان بھارت کے چھوٹے سے شہر دیواس گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں کے جین مندر کا مرکزی دروازہ بیس سال سے بند پڑا ہے۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ تین بھاری بھرکم قفل پہلی ہی نظر میں آدمی کو یہ سوچنے پر مجبور کردیتے تھے کہ آخر ایک دروازہ بند کرنے کے لیے تین قفل کیوں استعمال کیے گئے ہیں؟ جب میں نے مقامی لوگوں سے یہ سوال پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ایک تالہ دگمبر فرقے سے تعلق رکھنے والے جینیوں کا ہے اور دوسرا تالا اُن جینیوں نے لگا رکھا ہے جن کا تعلق شویتامبر مکتبہ فکر سے ہے جبکہ تیسرا تالا پولیس کو لگانا پڑا۔ بے چارے مہاویر بیس سال سے اپنے ہی مندر کے اندر قید تنہائی بھگت رہے ہیں۔ نہ کھانا' نہ نہانا' نہ ورشن نہ دیدار۔ میں بے اختیار یہ سوچنے لگا کہ اندر موجود مہاویر جی زندہ بھی ہیں یا نہیں کیونکہ مقامی لوگوں کے مطابق اندر سے کبھی کوئی آواز تو آئی ہی نہ تھی۔ کم از کم مہاویر دروازہ کھٹکھٹاتے' شور مچاتے اور باہر والوں کو حکما کہتے کہ دروازہ کھولو اور مجھے باہر آنے دو۔

بہرحال مہاویر کے بیس سال بند پڑے جین مندر کے دروازے پر لگے تین تالوں کی جو کہانی مجھے غیر جانبدار لوگوں کی زبانی معلوم ہوئی اس کا لب لباب یہ تھا کہ دیواس میں ایک ہی جین مندر تھا جو اب بند پڑا ہے۔ شہر میں جینی لوگ بہت کم تعداد میں ہیں اور اقلیت ہونے کے علاوہ ان کا دوسرا جرم غربت ہے لہٰذا وہ بمشکل ایک ہی مندر تعمیر کرپائے۔ دوسرے مندر کی تعمیر کا خواب ضرور دیکھا گیا لیکن یہ خواب ہی رہا۔ اب یہ جھگڑا کھڑا ہوگیا کہ مندر ایک اور فرقے دو۔ کیا ہونا چاہیے۔ عمر رسیدہ جینیوں نے یہ حل نکالا کہ عبادت کا وقت دونوں فرقوں میں مختلف ہونا چاہیے تاکہ کسی قسم کے تصادم یا اختلاف کی نوبت نہ آئے۔ بڑوں کی بات نے اثر کیا اور لوگ اس پر متفق ہوگئے۔ وقت کچھ یوں بانٹا گیا کہ صبح سے لے کر دن بارہ بجے تک دگمبر فرقے کے جینی عبادت کریں گے اور بارہ بجے کے بعد شام تک شویتامبر مکتبہ فکر کے لوگ اپنی روزمرہ کی رسوم ادا کرسکتے ہیں۔ یہ معمول بن گیا اور اس پر عمل کی کوشش بھی ہوئی لیکن ہر روز دونوں فرقوں میں ایک آدھ جھڑپ پھر بھی ہو ہی جاتی تھی۔ جین مت کے دگمبر اور شویتامبر نامی فرقوں میں جو اختلافات ہیں ان کی نوعیت نہایت عمومی اور غیر عقلی ہے۔ یہ اختلافات اس قدر بچگانہ ہیں کہ سراسر احمقانہ قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ دگمبر فرقے کے جینی مہاویر کی اس مورتی

کی پوجا کرتے ہیں جس پر انہیں آنکھیں بند کیے ہوئے دکھایا گیا ہو جبکہ شویتامبر کھلی آنکھوں والے مہاویر کی پوجا کرنا درست سمجھتے ہیں۔ یہی دونوں کا بنیادی اختلاف ہے۔

دراصل سنگ مرمر سے مہاویر کی مقدس مورتیاں تراشنے والے ہمارے غریب فنکاروں کے پاس دو ہی ممکنہ راستے ہوتے ہیں' وہ مورتی کی آنکھوں کو کھلا ہوا دکھا سکتے ہیں یا بند۔ سستے پتھروں سے مہنگے بھگوان بنانے والوں کے پاس کوئی تیسرا راستہ نہیں ہوتا۔ بھارت میں بھگوان سازی کی صنعت بنیادی طور پر گھریلو صنعتوں میں شمار ہوتی ہے اور اس پسماندہ گھریلو صنعت کے مفلس کاریگر ابھی اتنے چالاک نہیں ہوئے کہ ان کا بنایا ہوا مجسمہ ایک مخصوص بٹن دبانے پر آنکھیں کھول لے اور وہی بٹن دوبارہ دبائیں تو دیدے موند کر دھیان میں مگن ہوجائے۔ ایسا ممکن تو ہے لیکن بھارت میں بت سازی کا عمل جدید تکنیک سے محروم ہے ورنہ تمام فرقوں کی توقعات پر پورا اترنے والے بت بنانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ کبھی کبھی اس صورتحال پر میں بہت ''دکھی'' ہوجاتا ہوں کہ بے چارے بھگوان اس سائنسی تکنیک سے دور ہیں جو مغربی ممالک میں تیار ہونے والے عام سے کھلونوں تک کو میسر ہے۔ تمہارے بچے چند روپوں کے عوض خریدی ہوئی گڑیا کو لٹاتے ہیں تو اس کی آنکھیں یوں بند ہوجاتی ہیں گویا گہری نیند سو رہی ہو لیکن جیسے ہی اسے بٹھایا یا کھڑا کیا جائے' وہ فوراً اپنی آنکھیں کھول لیتی ہے۔ ایسی تبدیلیاں ایک عام سی سائنسی تکنیک کی بدولت وقوع پذیر ہوتی ہیں جو بچوں کے کھلونوں میں تو مستعمل ہے لیکن کروڑوں لوگوں کی دلی مرادیں پوری کرنے میں مصروف بھارتی دیوی دیوتاؤں کی قسمت میں نہیں ہے۔

دیواس کے اکلوتے جین مندر میں نصب مہاویر جی کا مجسمہ چونکہ دو ایسے فرقوں کی عقیدت کا محور تھا جو باہمی اختلافات کا شکار تھے لہٰذا انہوں نے کافی غور و فکر کے بعد ایک درمیانی راستہ نکالنے میں کامیابی حاصل کی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جو فرسودہ اور گھسی پٹی ترکیب دیواس والوں نے اپنائی' پورے بھارت کے جینی بوقت ضرورت اسی کی نقل کرتے ہیں۔ ہوتا یوں تھا کہ جب شویتامبر فرقے سے تعلق رکھنے والے جینی عقیدت مند اپنی روزمرہ عبادت کی انجام دہی کے لیے مندر میں جاتے تو چونکہ وہ کھلی آنکھوں والے مہاویر کو پوجتے تھے لہٰذا دو کھلی ہوئی مصنوعی آنکھیں مجسمے کی بند آنکھوں پر چپکا دیتے۔ عبادت سے فارغ ہوکر یہ لوگ نقلی آنکھیں اتارتے اور رخصت ہوجاتے۔ یہ ان کے مذہبی تنازعے کا ایک غیر تکنیکی اور سیدھا سادا حل تھا جس کی بدولت دونوں فرقوں کی مذہبی ضروریات اکلوتے مندر اور ایک ہی

مورتی سے پوری ہونے لگیں۔

لیکن اب ایک اور جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ روزانہ بارہ بجے' ٹھیک بارہ بجے مندر کے باہر موجود شویتانبر جینی اندر جانا چاہتے تا کہ مہاویر کی بینائی بحال کر کے اپنی عبادت کا آغاز کر سکیں لیکن دگمبر ہیں کہ مقررہ وقت ختم ہونے پر بھی باہر نہیں آرہے۔ وہ مہاویر ہی کی طرح آنکھیں بند کیے انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ مختلف منتروں کا جاپ کر رہے ہیں۔ یہ صورتحال شویتانبروں کے لیے ناقابل برداشت تھی' وہ مصنوعی آنکھیں اٹھائے مندر میں گھس جاتے اور مخالف فرقے پر جان بوجھ کر تاخیر کرنے کا الزام عائد کرتے' اسی لمحے کوئی جوشیلا جینی مصنوعی آنکھیں مہاویر کی بند آنکھوں کے عین اوپر چپکا تا اور پھر لڑائی شروع ہو جاتی۔ جب عبادت کم اور جھگڑا زیادہ ہونے لگا تو لامحالہ پولیس کو مداخلت کرنا پڑی۔ مقامی انتظامیہ کی طرف سے مندر کے دروازے پر بھاری بھرکم تالا لگا دیا گیا اور دونوں فرقوں کو اپنا جھگڑا عدالت کے ذریعے طے کرنے کی ہدایت کی گئی۔ دونوں گروہوں کے نمائندوں نے سرکاری تالے کے ساتھ ایک ایک تالا اپنی طرف سے بھی لگا دیا تا کہ مندر پر حق جتانے میں آسانی رہے اور مقدمہ لڑنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ عدالت لگی' مقدمہ شروع ہوا اور اب کئی سال گزرنے پر بھی صورتحال ڈھاک کے تین پات والی ہے۔ عدالت کے اعلیٰ تعلیم یافتہ جج بیس سال کی طویل مدت بیت جانے پر بھی کوئی فیصلہ سنانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ تمام تفصیلات جان کر میں سوچنے لگا کر عدلیہ یہ کیسے طے کرے گی کہ مہاویر جی کھلی آنکھوں سے ریاضت کرتے تھے یا بند آنکھوں سے؟ ہوسکتا ہے وہ اپنی آنکھیں ادھ کھلی رکھتے ہوں! افسوس کہ علم کی طرح جہالت کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔

ہاں' تو میں کہہ رہا تھا کہ والدین اپنے بچوں پر کوئی من گھڑت عقیدہ مسلط کرنے کی کوشش ہرگز نہ کریں۔ انہیں یہ مت بتائیں کہ زندگی کیا ہے اور مذہب کسے کہتے ہیں۔ کسی بھی طرح کا کوئی فلسفہ یا سیاسی نظام ننھے منے ذہنوں میں نہ ٹھونسا جائے۔ یاد رکھو نئی نسل کی ہدایت اور رہنمائی تمہارا نہیں بلکہ زمانے کا فرض ہے۔ بچوں کو زیادہ سے زیادہ ذہین بننے میں مدد دو اور یہ تبھی ممکن ہے جب تم اپنی ذہانت اپنے پاس رکھتے ہوئے انہیں ذہنی خود انحصاری سکھاؤ۔ ذہانت ایک ذہن سے دوسرے میں منتقل نہیں ہوسکتی' اگر ایسا ممکن ہوتا تو مہاتما بدھ کا بیٹا بھی مہاتما بدھ ہی ہوتا۔ ذہانت اپنی کوشش سے حاصل کی جاتی ہے' اسی لیے میں کہتا ہوں کہ سیکھنے کے معاملے میں بچوں کے ذہنی رجحانات میں مداخلت نہ کرو تا کہ وہ جوان ہوں اور

سچائی کی جستجو میں لگ جائیں۔ یہ تلاش اور تحقیق ایسی ہے کہ عمر بھر بھی جاری رہ سکتی ہے۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ عموماً پیدا ہوتے ہی تمہیں تمہارے دھرم کا تحفہ پیش کر دیا جاتا ہے حالانکہ سچ یہ ہے کہ عمر بھر کی جستجو کے بعد اگر مرتے وقت بھی معلوم ہو جائے کہ دھرم کیا ہے تو یہی سمجھو کہ تم بہت جلد آگاہ ہو گئے۔ جستجو کے بعد سچائی جیسی قیمتی جاگیر کا حصول مکمل آزادی ہی میں ممکن ہے اور مکمل آزادی سے میری مراد ہے ہمہ جہت آزادی۔ میں صرف مذہبی آزادی کی بات نہیں کر رہا کیونکہ یہ تو ہمہ جہت آزادی کی محض ایک ادنیٰ سی جہت ہے۔

میں مذاہب اور ریاستوں کو غیر ضروری سمجھتا ہوں' تمام مذہبی اور ریاستی حدود و قیود انسانیت کے پاؤں کی صدیوں پرانی زنجیریں ہیں' جنہیں اب ٹوٹ جانا چاہیے۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تم انسان کو انسان کی حیثیت سے قبول کرو۔ میں مغرب کے انسانیت پسندوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم نے انسان کو زبان' رنگ' نسل' مذہب اور ملک کے چھوٹے چھوٹے قید خانوں میں کیوں بند کر رکھا ہے۔ آج میں ہمہ جہت آزادی کو انسان کا بنیادی حق اس لیے قرار دے رہا ہوں کہ وہ ایک بھی جہت میں آزاد نہیں ہے۔

مجھے امریکہ میں بلا جواز گرفتار کر کے ایک ریاستی جیل میں ڈال دیا گیا۔ وہاں ایک امریکن مارشل جیل خانے کی دستاویزات لے کر آیا اور کہنے لگا:

''اس فارم پر تمہیں اپنا نام ڈیوڈ واشنگٹن لکھنا ہوگا۔''

میں نے کہا: ''یہ پہلا موقع ہے کہ کسی امریکی اجنبی نے مجھے میرا اصل نام بتایا ہے' چونکہ تم دوسروں کے خیالات پڑھنے میں خاص مہارت رکھتے ہو' لہٰذا مجھے تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔'' یہ سن کر مارشل گڑبڑا گیا اور بولا: ''کیا سچ مچ یہ تمہارا اصلی نام ہے؟''

میں نے کہا ''بالکل''۔

''پھر تو تمہیں یہ نام بدلنا پڑے گا' چلو' کوئی بات نہیں' کسی اور نام سے بھی کام چل جائے گا۔'' اس نے کہا۔

میں نے جواب دیا: ''تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو اور یہ بھی جانتے ہو کہ ڈیوڈ واشنگٹن میرا حقیقی نام نہیں ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے آتے ہی یہ کیوں کہا تھا کہ میں اپنا نام ڈیوڈ واشنگٹن ہی لکھوں؟ تم امریکی لوگ بڑے فخر سے اپنے ملک کو جمہوریت اور انسانی آزادی کا علمبردار قرار دیتے ہو۔ مجھے بتاؤ' یہ کس قسم کی جمہوریت اور انسانی آزادی ہے کہ کوئی اپنا درست نام بھی تحریر نہ کر سکے۔ مجھے آگاہ تو کرو کہ تمہارے ''عظیم ملک'' میں کون کون

سی انسانی آزادیاں رائج ہیں؟ تمہارے کوٹ پر بڑے بڑے حروف میں 'محکمہ' قانون و انصاف' ریاستہائے متحدہ امریکہ' تحریر ہے' کم از کم یہ کوٹ تو اتار دو۔ یاد رکھو! نہ تو میرا نام ڈیوڈ واشنگٹن ہے اور نہ ہی میں اپنے حقیقی نام کے علاوہ کوئی دوسرا نام لکھوں گا۔''

وہ حیرت زدہ کھڑا تھا اور میں کہہ رہا تھا: ''زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں کہ جمہوری ملک کیسے ہوتے ہیں اور انسانی آزادی سے تم لوگ کیا مراد لیتے ہو۔ مجھے اپنا حقیقی نام تک لکھنے کی اجازت نہیں دی جا رہی۔ آخر اس کا مطلب کیا ہے؟''

وہ خفت آمیز لہجے میں بولا: ''تمہارے کسی سوال کا جواب تو میں نہیں دے سکتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے جو بھی کہا' وہ میری ذمے داریوں کا حصہ تھا۔ حکام بالا کے جو احکامات مجھے موصول ہوئے ہیں ان کے مطابق تمہارا نام 'ڈیوڈ واشنگٹن' لکھا جائے گا اور جیل میں بھی تمہیں اسی نام سے پکارا جائے گا۔''

میں نے کہا: ''اگر یہ صورتحال ہے تو پھر میں کسی بھی فارم کو اپنے ہاتھ سے پر نہیں کروں گا' ہاں اگر یہ فریضہ رضاکارانہ طور پر تم خود انجام دینا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں اور بعدازاں اپنے دستخط کرنے کا وعدہ میں کر سکتا ہوں۔'' اس ناخوشگوار بحث میں کافی وقت ضائع ہوا' اب رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اور مارشل کو گھر جانے کی جلدی تھی' میں نے دستاویزات اپنے ہاتھ سے پر کرنے سے صاف انکار کر دیا تو مجبوراً وہ خود مختلف خانوں میں ضروری اندراجات کرنے لگا۔ بعدازاں حسب وعدہ جہاں اس نے کہا' میں نے اپنے دستخط کر دیے۔ وہ دستخطوں کو شک بھری نگاہوں سے بغور دیکھ کر بولا: ''لیکن یہ 'ڈیوڈ واشنگٹن' جیسے تو نہیں لگتے۔''

میں بولا: ''تم درست کہتے ہو' میرے دستخط واقعی 'ڈیوڈ واشنگٹن' جیسے نہیں لگتے' میری طرف غور سے دیکھو' امید ہے کہ میں بھی تمہیں 'ڈیوڈ واشنگٹن' جیسا نہیں لگوں گا۔''

مارشل کہنے لگا: ''تم بہت عجیب آدمی ہو' لگتا ہے کہ تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔''

میرا جواب تھا: ''تم اپنے آپ کو خود دھوکہ دے رہے ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میرا نام کیا ہے۔ اب کل ساری دنیا یہ جان جائے گی کہ نام نہاد جمہوری اور آزاد امریکہ جو انسانی آزادی کا جھنڈا اٹھائے پھرتا ہے' بلاوجہ گرفتار کیے گئے لوگوں کو اپنے اصلی دستخط کرنے کی آزادی بھی نہیں دیتا۔ میں یہ کڑوا سچ تمہارے اپنے ذرائع ابلاغ کی گز بھر لمبی زبان پر رکھ دوں گا۔''

میری یہ دھمکی سنتے ہی اس کا حلق خشک ہو گیا تو اس کی قابل رحم حالت دیکھ کر میں نے کہا:

''کیا تم جانتے ہو کہ اعلیٰ افسران نے تمہیں اس نوعیت کے احکامات کیوں دیئے۔''

''نہیں' میں نہیں جانتا۔'' مارشل نے مختصر سا جواب دیا۔

میں نے کہا: ''تمہاری لاعلمی پر مجھے سخت حیرت ہے کیونکہ جو بات تم محکمے کے اندر رہتے ہوئے نہیں جانتے' اس سے میں غیر متعلق ہوتے ہوئے بھی آگاہ ہوں۔ یہ ایک سیدھی سادی اور منطقی بات ہے کہ تمہارے افسران چاہتے ہیں کہ اگر مجھے جیل میں ہلاک بھی کر دیا جائے تو کسی کو خبر تک نہ ہو کہ میں کہاں غائب ہوں۔ کیونکہ تمہاری دستاویزات تو یہ بتائیں گی کہ میں کبھی قید ہی نہیں ہوا' قید تو 'ڈیوڈ واشنگٹن' تھا۔''

میری زبان سے یہ باتیں سن کر مارشل کو حیرت کے پے در پے جھٹکے لگے۔ میں نے اسے کہا: ''تم نے جو کچھ بھی سنا' سچ سنا' اگر یہ سچ نہیں ہے تو پھر میرا نام بدلنے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی۔ کسی کو یہ حق کیسے ہے کہ وہ میرا نام بدلنے کی کوشش کرے۔''

یہ ہے شخصی آزادی کا ڈھول پیٹنے والے امریکہ کی اصل حالت۔ میں اس لیے ہمہ جہت آزادی کی بات کرتا ہوں کہ انسان ایک بھی جہت میں آزاد نہیں ہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے' جب میں کالج میں داخلہ لینے کے لیے پر تول رہا تھا۔ ماں باپ کی خواہش تھی کہ میں مذہبی یا طبی علوم کی تحصیل کروں۔ میں نے ان سے استفسار کیا:

''پڑھنے میں جا رہا ہوں یا آپ لوگ؟''

وہ کہنے لگے: ''ظاہر ہے' تم جا رہے ہو' ہم بھلا کیوں جانے لگے؟''

''تو پھر یہ بات بھی مجھ پر چھوڑ دی جائے کہ میں نے کیا پڑھنا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہم تمہیں یہ حق دے سکتے ہیں لیکن واضح رہے کہ اپنی پسند کے مضامین اختیار کرتے ہی تم یہ خیال دل سے نکال دینا کہ ہم تمہاری مالی مدد جاری رکھیں گے۔'' ماں باپ کی یہ دھمکی سن کر میں بولا: ''ہاں یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔''

اپنی بات پر بضد رہنے کے بعد جب میں گھر سے چلا تو پھوٹی کوڑی تک پاس نہ تھی اور یہ پھوٹی کوڑی والی بات میں نے محاورتاً نہیں کہی بلکہ واقعتاً میں خالی ہاتھ تھا۔ بہرحال' بوریا بستر سمیٹ کر چلا اور کالج تک کا سفر بغیر ٹکٹ کے طے کیا۔ گاڑی میں سوار ہونے کے بعد میں

خود ٹکٹ چیکر کے پاس گیا اور تمام صورتحال اسے تفصیل سے بتانے کے بعد پوچھا:

''کیا آپ مجھے بغیر ٹکٹ سفر کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں؟''

وہ کہنے لگا ''زندگی میں پہلی بار کسی نے دیانتداری سے یہ سوال پوچھا ہے ورنہ مفت سفر کے عادی تو مجھے دیکھتے ہی ادھر ادھر کھسک جاتے ہیں۔ وہ لوگ سفر بھی کرتے ہیں اور دھوکہ بھی دیتے ہیں۔ تم بےفکر رہو اور آرام سے سفر کرو۔'' اس طرح میں کالج تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔

کالج پہنچتے ہی میں بلاتوقف وائس پرنسپل کے پاس گیا اور اُسے بھی ساری رام کہانی کہہ سنائی۔ میں نے کہا

''میں درشن شاستر (کتب فلسفہ) پڑھنا چاہتا ہوں' لیکن گھر والوں کی طرف سے مجھے تعلیم کے لیے اپنا پسندیدہ موضوع منتخب کرنے کی بھی آزادی نہیں ہے۔ اب آپ کو مجھے وہ تمام سہولیات فراہم کرنا ہوں گی جو ایک طالب علم کے لیے ضروری ہیں کیونکہ میری ضروریات کے لیے گھر والے کوئی مالی مدد نہیں دیں گے۔ اگر آپ کا جواب ہاں ہے تو بہتر' بصورت دیگر میں بھوکا پیاسا رہ کر بھی فلسفے کی تعلیم حاصل کروں گا' چاہے فاقے کرتے کرتے مر ہی کیوں نہ جاؤں۔''

وائس پرنسپل کہنے لگا: ''تم یوں نہ کرنا' ورنہ انتظامیہ اور ادارہ بدنام ہو کر رہ جائے گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری ہر جائز ضرورت پوری کی جائے گی۔''

میں نے یہ واقعہ تمہیں اس لیے سنایا ہے کہ ماں باپ شروع ہی سے نئی نسل کی آزادی کو ختم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ وہ بچوں کو پنجرے میں قید پرندوں جیسا بنا دینا چاہتے ہیں' ان کی پہلی ترجیح یہی ہوتی ہے کہ ان قیدیوں کے پر کاٹ دیئے جائیں تاکہ یہ پنجرے سے نکل بھی جائیں تو پرواز نہ کر سکیں۔ ہم اپنے بچوں کو اپنی ذاتی خواہشات کا غلام بنا دیتے ہیں اور مقدور بھر کوشش کرتے ہیں کہ دنیا میں آنے والا ہر نیا انسان ہماری ذاتی ترجیحات کے سانچے میں ڈھل جائے۔ یاد رکھو یہ عمل آزادی جیسی مثبت چیز کو تباہ کرنے کے برابر ہے۔ اپنے ہونے کا احساس انتہائی قیمتی احساس کا درجہ رکھتا ہے اور یہ بھی ہر کسی کا حق ہے کہ اسے اپنی ذات کے انفرادی اور آزادانہ وجود کا احساس ہو۔

ایک قابل تعریف انسانی سماج میں ہر کسی کو ''اپنے جیسا بننے'' کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ اگر وہ بانسری بجانے والا بھی بننا چاہے تو اسے روکنے کا حق کسی کو نہیں دیا جا سکتا۔

ایک شخص دنیا کا امیر ترین آدمی بننے کی بجائے بھکاری بننا چاہتا ہے تو کسی کو اس کے ذاتی عزائم تبدیل کرنے کی کوشش ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔

میں پھر کہتا ہوں کہ ہمہ جہت آزادی تمہارا بہت قیمتی اثاثہ ہے۔ تم اپنے ملک کے صدر نہ بنو' راستے کے کنارے چلتے بانسری بجانے والے بن جاؤ' پھیری لگانے والے بن جاؤ' لیکن اس بات پر کوئی سمجھوتہ نہ کرو کہ تم ''تم'' ہو۔ کسی بھی حیثیت میں' اپنے ہونے کا احساس اتنی گہری طمانیت بخشتا ہے اور اتنا سکون آور ہوتا ہے کہ اگر تم اسے محسوس نہ کر پاؤ تو سمجھ لو تم سے بھول ہو رہی ہے۔

(7) ایک دھرتی' ایک انسانیت

مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ دنیا میں بہت سے ممالک ہوں۔ کرۂ ارض کے نقشے پر سینکڑوں لکیریں کیوں کھینچی جائیں؟ غور طلب بات یہ ہے کہ ایسی لکیریں صرف نقشے پر ہی ہوتی ہیں اور نقشے انسان بناتے ہیں۔ آسمان کی طرف دیکھو' دھرتی پر نگاہ دوڑاؤ' کہیں کوئی تقسیمی لکیر نظر نہیں آئے گی۔

میں یقین سے کہہ سکتا ہوں اور تمہیں ماننا پڑے گا کہ قدرت نے زمین کو ٹکڑوں کی صورت میں تخلیق نہیں کیا بلکہ زمین کی مصنوعی تقسیم چند انسانوں کی غیر انسانی کارروائی ہے۔

مجھے اپنے ایک استاد اکثر یاد آتے ہیں' وہ بہت پیارے اور انقلابی آدمی تھے۔ کسی بات کو سمجھانے کا ان کا اپنا ہی ایک منفرد انداز تھا۔

ایک دن کلاس روم میں گتے کے کچھ ٹکڑے اٹھا لائے' انہیں میز پر ڈھیر کر دیا اور لڑکوں سے کہنے لگے:

''دیکھو! یہ دنیا کا نقشہ ہے لیکن میں نے اسے پھاڑ کر درجنوں بے ترتیب ٹکڑوں کی صورت دے دی ہے۔ تم میں سے جسے ذہانت کا دعویٰ ہو اور وہ یہ ٹکڑے درست انداز میں میز پر جما کر پھٹا ہوا نقشہ پھر سے مکمل کر سکتا ہو' سامنے آئے۔''

ایک لڑکے نے کوشش کی لیکن بے سود رہی' پھر دوسرے کے بعد تیسرا بھی وقت ضائع کر کے چلتا بنا' چوتھے طالب علم کی محنت بھی رنگ نہ لائی اور پانچواں تو چند ہی لمحوں میں ہار مان کر واپس اپنی نشست پر آن بیٹھا۔ میں چھٹا تھا۔

پانچوں ناکام ساتھیوں کی کارکردگی کا بغور مشاہدہ کرنے کے علاوہ میں اس نکتے پر

بھی غور وفکر کر رہا تھا کہ وہ کیوں کامیاب نہیں ہو سکے اور اب جبکہ میں اپنی نشست سے اٹھ کر استاد کے سامنے رکھے میز کی طرف بڑھ رہا تھا تو میرے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔

میں گیا اور جاتے ہی گتے کے تمام ٹکڑے میز پر الٹے جما دیے۔ استاد بولے:

''یہ کیا کر رہے ہو؟''

میں نے کہا: ''آپ دیکھتے رہیں' مجھ سے پہلے پانچ لڑکے ناکام ہو چکے ہیں لیکن میں نے ان کی ناکامی کی وجہ جان لی ہے لہٰذا نقشہ مکمل کر کے ہی دم لوں گا۔''

اصل میں نقشے کے دوسری طرف ایک آدمی کی تصویر تھی' لہٰذا پہلے میں پھٹے ہوئے ٹکڑے الٹے جما کر آدمی کی تصویر مکمل کرنے لگا' یہ بہت آسان عمل تھا جس کے انجام پاتے ہی سیدھی طرف موجود دنیا کا نقشہ خود بخود مکمل ہو گیا۔ درحقیقت اس معمے کا یہی وہ پہلو تھا جس کی طرف مجھ سے پہلے کوشش کرنے والوں کی توجہ مبذول نہ ہو سکی۔ جب وہ لوگ ٹکڑے جوڑنے کی تگ و دو کر رہے تھے تو میں نے دیکھ لیا تھا کہ ٹکڑوں کے دوسری طرف بھی کوئی تصویر وغیرہ ہے جس سے مدد لی جا سکتی ہے۔

میری کامیابی پر تبصرہ کرتے ہوئے استاد نے کہا ''تم بہت بدمعاش ہو۔ میرا خیال تھا کہ تم سب سے پہلے نقشہ مکمل کرنے آؤ گے لیکن تمہارے بیٹھے رہنے سے میں نے بھی یہی اندازہ لگایا تھا کہ تم کامیابی کی کلید کے بارے میں سوچ رہے ہو اور پھر واقعی تم نے یہ کلید پا لی۔''

بعدازاں اس واقعے کی یاد نے مجھے اس نتیجے تک پہنچنے میں مدد دی کہ یہ تقسیم شدہ دنیا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ انسان بٹ چکا ہے۔ انسان کیوں بٹ چکا ہے؟ اس لیے کہ وہ ایک منقسم دنیا میں زندہ ہے۔

دنیا اور انسانیت کو ایک ہو جانے دو۔ پھر تم خود دیکھو گے کہ ریاستیں نابود ہو گئی ہیں اور جغرافیائی نقشوں کی لکیریں اپنی موت آپ مر گئی ہیں۔ اس عمل کا آغاز کسی بھی خطے' کسی بھی ملک اور کسی بھی شہر سے کیا جا سکتا ہے۔ یاد رکھو! یہ دنیا ہماری ہے اور ہم اسے ''ایک دھرتی' ایک انسانیت'' کے تصور پر عمل کر کے جنت بنا سکتے ہیں۔ یہ بھی انسان کا اولین بنیادی حق ہے کہ وہ دھرتی کو ایک کونے سے دوسرے کونے تک اپنی کہہ سکے۔ علاوہ ازیں خود کو ایک ہی انسانیت کا ناگزیر حصہ سمجھنا بھی ہر انسان کا قابل احترام بنیادی حق ہے۔ یہ حق غصب کر لیا گیا ہے' یہی وجہ ہے کہ قدرت کی بنائی وسیع و عریض دھرتی دوزخ کا روپ اختیار کر چکی ہے۔

یہاں دوزخ کے بارے میں لمبی چوڑی تفصیلات بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں' اپنے اردگرد دیکھو' تمہیں ہر طرف دوزخ ہی کے منظر نظر آئیں گے۔

مجھے ایک کہانی یاد آ رہی ہے۔ ایک آدمی مر گیا۔ وہ چور تھا' ڈاکو تھا' قتل کرنا اس کے لیے ایک عام سی بات تھی اور زنا کو تو وہ ایک دلچسپ کھیل سمجھتا تھا غرضیکہ کوئی ایسا جرم نہ تھا جو دنیا میں ہوتا ہو اور اس نے نہ کیا ہو۔ جب بعداز مرگ وہ فرشتوں کے قابو میں آیا تو پوچھنے لگا:

''لازماً تم مجھے دوزخ میں پھینک دو گے۔''

فرشتے بولے: ''ہرگز نہیں۔''

''کیا؟'' وہ آدمی حیرت زدہ رہ گیا۔

فرشتوں نے اس کی حیرت دور کرتے ہوئے جواب دیا: ''دوزخ میں تو تم جی چکے ہو' بلکہ اپنی انسانیت دشمنی کے سبب تم نے دنیا کو دوزخ سے بھی بدتر بنا دیا ہے' اس لیے اب تمہیں کوئی اور سزا دی جائے گی جو تمہارے شایان شان ہو۔''

دنیا کی زخموں سے بھری تاریخ ملاحظہ کریں تو یہ کہانی بامعنی معلوم ہوتی ہے۔ آج بھی گردوپیش پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے ہی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ انسان کس قدر بھیانک دکھوں کو سینے سے لگائے زندہ ہے۔ جس دنیا میں تم زندگی کے دن پورے کر رہے ہو' یہ اتنی ہلاکت خیز اور بدصورت ہے کہ اس کی موجودگی میں کسی اور دوزخ کی ضرورت ہی کیا ہے!!!

میری ان باتوں سے مایوس نہ ہونا کیونکہ ہم دنیا کو دوزخ سے دوبارہ جنت بھی بنا سکتے ہیں لیکن اس کے لیے ہمیں نقشوں سے لکیروں کا خاتمہ کرنا ہوگا اور یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ دنیا کا ہر انسان پوری دھرتی کا مالک اور ایک ایسی انسانیت کا لازمی حصہ ہے جو ہر طرح کی تقسیم سے بالاتر ہے۔

(8) شخصی انفرادیت

شخصی انفرادیت ہر انسان کا غیر متنازعہ حق ہے' جسے کسی بھی قیمت پر برقرار رہنا چاہیے۔ یاد رہے کہ دنیا کا ہر انسان ہر حوالے سے ناقابل موازنہ ہے۔

شخصی انفرادیت کا بنیادی انسانی حق غصب کرنے کے لیے ایک انتہائی خوبصورت لفظ کا اتنا بھدا استعمال کیا گیا ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے' اور وہ لفظ ہے: مساوات۔

کچھ مفکرین کا کہنا ہے کہ سبھی انسان ایک سے ہیں۔ اس مفروضے کی تائید میں اقوام متحدہ نے اعلان کیا کہ مساوات انسان کا پیدائشی حق ہے۔ لیکن کسی نے بھی اس پہلو پر غور نہیں کیا کہ انسان ایک سے ہرگز نہیں ہیں اور نہ ہی کبھی تھے۔ عالمی ذرائع ابلاغ بھی اس حوالے سے سامراجی طاقتوں اور اقوام متحدہ ہی کی بولی بولتے ہیں۔ مگر یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ انسانوں کو ایک سے کہنا سراسر غیر علمی اور غیر حقیقی ہے۔

ہر انسان ناقابل موازنہ ہے جونہی تم سب ایک سے ہوتے ہو تو نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ دیکھنے والی آنکھ انسانوں کی بجائے ایک بھیڑ کا مشاہدہ کرتی ہے۔ ایک سے ہو کر تمہاری انفرادیت چھن جاتی ہے اور تم خود پہیہ نہ رہتے ہوئے ایک بڑے پہیے کا حصہ بن جاتے ہو۔

میں تمہیں مساوات نہیں سکھاتا اور نہ ہی عدم مساوات کا درس دیتا ہوں بلکہ میں تو شخصی انفرادیت کی تعلیم دیتا ہوں۔ ہر آدمی منفرد ہے اور اس کی انفرادیت کا احترام کیا جانا چاہیے۔ شخصی انفرادیت کو مزید نکھارنے کے لیے یکساں مواقع ہر کسی کو ملنے چاہئیں کیونکہ یہ ہر انسان کا پیدائشی حق ہے کہ وہ منفرد رہے اور اپنی انفرادیت کے استحکام کو یقینی بنانے کی ہر ممکن کوشش کرے۔

شخصی انفرادیت ایک بہت بڑے سچ کا نام ہے۔ ثبوت کے لیے یہی کہہ دینا کافی ہے کہ دو ہزار سال گزرنے کے بعد بھی انسانی مساوات کے علمبردار دوسرا مسیح" پیدا نہیں کر سکے اور نہ ہی کر سکتے ہیں کیونکہ مسیح" منفرد تھے۔ ان جیسا نہ کوئی ہوا ہے نہ ہوگا۔ کیونکہ اپنے جیسے وہ خود تھے۔ پچیس صدیاں گزر گئیں لیکن ہم کوئی دوسرا گوتم بدھ نہیں دیکھ سکے۔ کیوں؟ اس لیے کہ انسان ایک سے نہیں ہوتے بلکہ منفرد ہوتے ہیں۔ لیکن لاتعداد جاہل آج بھی یہی جھوٹ دہرائے چلے جا رہے ہیں کہ تمام انسان ایک سے ہیں۔

یاد رکھو! ہر انسان منفرد ہے اور اس کی انفرادیت کا ہر سطح پر احترام کیا جانا چاہیے۔ دنیا میں کوئی بھی آدمی کسی دوسرے سے کمتر یا بالاتر نہیں ہے بلکہ ہر آدمی منفرد ہے۔ کوئی اس جیسا نہیں ہے کیونکہ اپنے جیسا صرف وہ خود ہی ہے۔ انفرادیت میں یہ خوبصورتی ہے کہ یہ تمہیں مجمع نہیں بننے دیتی بھیڑ نہیں بناتی اور بے شناخت نہیں کرتی بلکہ ایک ذاتی تشخص فراہم کرتی ہے جو صرف تمہارا ہوتا ہے۔

(9) عالمگیر حکومت

میں اس وقت قائم تمام حکومتوں کے خلاف ہوں

لیکن ایک عالمگیر حکومت کی حمایت کرتا ہوں کیونکہ یہ انسانی حقوق کی مکمل بازیابی کو یقینی بنائے گی۔ جب میں عالمگیر حکومت کی وکالت کرتا ہوں تو دراصل تم سے یہ وعدہ کر رہا ہوتا ہوں کہ دنیا کے طول و عرض سے جنگوں کی نحوست کا مستقل طور پر خاتمہ ہو جائے گا' تب کروڑوں لوگوں کو بلاجواز فوج میں بھرتی کر کے انسانوں کو انسانوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارنے کی قبیح رسم ہمیشہ کے لیے دفن کر دی جائے گی' نتیجتاً کروڑوں بندوقیں تھامنے والے اربوں ہاتھ پیداواری عمل میں شریک ہو جائیں گے اور عوامی فلاح و بہبود کے منصوبوں پر کام کریں گے۔ میں جس مثالی حکومت کا حامی ہوں وہ دنیا سے غربت کے مکمل خاتمے کی ضمانت دے گی۔

آج ہر ملک کی ستر فیصد ریاستی آمدنی دفاعی اخراجات پر خرچ کی جاتی ہے یعنی دنیا کا ہر ملک اگر یومیہ سو ڈالر کماتا ہے تو روزانہ ستر ڈالر صرف عسکری اخراجات میں برباد کر دیتا ہے۔ یوں دنیا کا ہر ملک اپنی کل کمائی کے صرف تیس فیصد باقی ماندہ حصے پر گزر اوقات کر رہا ہے۔ اب سوچو' اگر فوج ختم کر دی جائے تو کیا ہر ملک کو ترقی کے لیے مزید ستر فیصد وسائل میسر نہ آ جائیں گے؟ کرۂ ارض میں اگر ایک بھی فوجی نہ ہو تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ غربت ختم ہو جائے اور بھکاری تلاش کرنے پر بھی نہ ملیں۔

بھوکے انسان' مفلس بھکاری اور ایتھوپیا جیسے خطے ہماری اپنی ایجاد ہیں۔ ایک طرف ہم اربوں ڈالر خرچ کر کے ''عظیم الشان'' افواج تیار کر رہے ہیں اور دوسری طرف انسانیت کو بھوک کے عذاب میں مبتلا کر رہے ہیں۔

فاقوں سے مرتے انسانوں کے لیے فوجوں نے کیا قربانی دی ہے؟ دنیا نے افواج کی صورت میں صرف کاروباری قاتلوں کے گروہ تیار کیے ہیں' یہ کاروباری مجرم ہیں' باقاعدہ تربیت یافتہ مجرم۔ ہم انہیں لوگوں کو ہلاک کرنے کی تربیت دے رہے ہیں اور اس تربیت پر اپنی لگ بھگ تین چوتھائی قومی آمدنی خرچ کر رہے ہیں۔

نعرے تو ہر ملک انسانیت کے لگاتا ہے لیکن اپنی مجموعی قومی آمدنی کا ستر فیصد حصہ خون خرابے کے لیے مخصوص رکھتا ہے! یہ کیسا سنگین تضاد ہے؟ یہ کتنی سفاکانہ منافقت ہے؟

اسی لیے میں کہتا ہوں کہ افواج کی ضرورت سے بے نیاز عالمگیر حکومت کا قیام ایک عظیم الشان تبدیلی ہے' بلکہ ایک انقلاب ہے جو پورے کرۂ ارض کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ ایسی حکومت کے قیام کے لیے کوشش کرنا اور جب حکومت بن جائے تو اس کے ثمرات سے براہ راست مستفید ہونا ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔

یہاں میں یہ بھی واضح کردوں کہ عالمگیر حکومت صرف انتظامی ہوگی' وہ اپنے پاس طاقت نہیں رکھے گی۔ آج تو تمہاری سبھی حکومتیں طاقت کے بل بوتے پر چلتی ہیں لیکن عالمگیر حکومت کو طاقت کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس بات کی مزید وضاحت میں یوں کرتا ہوں کہ جیسے تمہارے ہاں پوسٹ ماسٹر جنرل ہوتا ہے' تو وہ صرف انتظامی آدمی ہے' اس کے ہاتھ میں طاقت نہیں ہوتی کیونکہ وہ صرف کچھ طے شدہ فرائض ادا کرتا ہے۔ طاقت کا حصول پوسٹ ماسٹر جنرل کی ترجیح نہیں کیونکہ اسے طاقت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اسی طرح محکمہ ریلوے کا سربراہ ہے۔ اس کے ہاتھ میں کون سی طاقت ہوتی ہے؟ ہوائی فوج کے سربراہ کی مثال لے لو۔ اس کے پاس کون سی طاقت ہوتی ہے؟ یہ سب انتظامی عہدے ہیں' جن پر مامور افراد کو کچھ مخصوص کام ہر صورت میں انجام دینے ہوتے ہیں اور اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کے لیے انہیں طاقت کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

اگر دنیا بھر میں ایک ہی حکومت ہوگی تو وہ از خود انتظامی نوعیت کی ہوگی۔ یہ آج کی حکومتوں سے نہیں ہوسکتا کہ وہ خود کو صرف انتظامی امور تک محدود کرلیں کیونکہ دوسرے ممالک کا خوف مسلسل عوام پر طاری رکھا جاتا ہے۔ اس طرح کے نعرے تم آئے دن سنتے ہو کہ ''اپنے رہنماؤں کے ہاتھ مضبوط کرو' اپنے رہنماؤں کو پورا تعاون فراہم کرو۔'' لیکن اگر جنگ ہی نہ ہو تو کسی کے ہاتھ مضبوط کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ طاقت کے حصول کی ضرورت صرف تصادم کی صورت میں محسوس ہوتی ہے۔

ایک انتظامی عالمگیر حکومت کے پاس استعداد کار تو ہوگی جیسے کہ محکمہ' ڈاک' ریلوے یا ہوائی فوج کے پاس ہے لیکن طاقت نہیں ہوگی..... پھر دنیا بہت خوبصورت ہوگی' جہاں تمہیں معلوم ہی نہ ہوگا کہ کون صدر ہے اور کون وزیراعظم۔ تب سبھی تمہارے خدمتگار ہوں گے۔ لیکن آج کے حکمران تو تمہارے مالک بنے ہوئے ہیں' وہ طاقت کے حصول کے لیے تمہیں ہر وقت خوفزدہ کیے رکھتے ہیں کہ پاکستان بھارت سے جنگ کی تیاریاں کررہا ہے لہٰذا تمہیں پوری طاقت بھارتی رہنماؤں کے ہاتھ میں دے دینی چاہیے..... چین جلد ہی

بھارت پر حملہ کرنے والا ہے لہٰذا.....

ایڈولف ہٹلر نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ طاقت کے حصول کا واحد طریقہ یہ ہے کہ عوام کو خوفزدہ کیے رکھو۔

ہٹلر کا یہ قول بالکل درست ہے کیونکہ کبھی کبھی پاگل لوگ بھی عقلمندوں جیسی باتیں کہہ جاتے ہیں۔

(10) قابل شاہی

جمہوریت ناکام ہوچکی ہے۔

تم کئی طرح کے حکومتی نظام دیکھ چکے ہو: اشرافیہ کی حکومت' بادشاہت' مطلق العنانیت اور شہری جمہوریتوں کا نظام۔ اگرچہ آج پوری دنیا جمہوریت کے نشے میں بے سدھ پڑی ہے' لیکن میں نہیں سمجھتا کہ جمہوریت نے ایک بھی انسانی مسئلہ سلجھایا ہو' بلکہ اس کے برعکس یہ نظام مزید مسائل پیدا کرنے کا باعث بنا ہے اور یہی مسائل تھے جنہوں نے کارل مارکس کے فلسفے اور انقلاب روس کی راہ ہموار کی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم جمہوریت سے بہت آگے دیکھو اور اس تصور کو بطریق احسن سمجھ لینے پر قادر ہوجاؤ جو میرے ذہن میں مچل رہا ہے۔

جمہوریت کی سب سے مشہور تعریف یہ ہے کہ لوگوں کی حکومت' لوگوں کے ذریعے اور لوگوں کے لیے۔ لیکن یہ صرف ایک نعرہ ہے اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ دنیا میں کہیں بھی اس تعریف پر عملاً پوری اترنے والی مثالی حکومت موجود نہیں رہی۔ صرف بھارت ہی میں نوے کروڑ لوگ ہیں۔ کیا ان کے پاس طاقت ہے؟ نہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہ نوے کروڑ لوگ اپنی طاقت چند افراد کو سونپنے پر مجبور ہیں۔ کیا یہی جمہوریت ہے؟

لوگوں کی حکومت کبھی قائم نہیں ہوتی بلکہ لوگوں کے ذریعے منتخب ہونے والے لوگ حکومت بناتے ہیں۔ لیکن کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ تم کس بنیاد پر انہیں منتخب کرتے ہو؟ کیسے منتخب کرتے ہو؟ کیا تم میں قابل اور موزوں لوگوں کو منتخب کرنے کی قوت ہے؟ اور کیا تم نے جمہوری طرز حیات کی تربیت حاصل کی ہے؟ نہیں' کچھ بھی نہیں ہوا' یہ تمام جہتیں ابھی تک بے عملی سے اٹی پڑی ہیں۔

جاہل عوام کو نہایت آسانی سے چھوٹی چھوٹی باتوں کے بتنگڑ بنا کر ذہنی طور پر مفلوج کیا جاسکتا ہے۔ اس بات کی سچائی کا ثبوت چاہیے تو میں وہ بھی دیتا ہوں۔ یاد

کرو! امریکہ کے صدارتی انتخابات میں نکسن' کینیڈی سے شکست کھا گیا اور ماہرین نفسیات کے تجزیوں کے مطابق اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ کینیڈی ٹی وی سکرین پر نکسن سے زیادہ وجیہہ اور پرکشش نظر آتا تھا۔

یہ بات جب نکسن کو معلوم ہوئی تو وہ نہایت تندہی سے اپنی کانٹ چھانٹ میں جت گیا۔ اس نے اپنی ذات' حرکات وسکنات اور نشست و برخاست کے اطوار میں بہت سی تبدیلیاں کیں۔ آئندہ انتخابات کے لیے اس نے یہ سب کچھ سیکھا کہ بولنا کیسے ہے' مسکرانا کیسے ہے' بیٹھنا کیسے ہے' کھڑا کیسے ہونا چاہیے' کپڑے کس طرح کے ہوں اور یہاں تک کہ کپڑوں کے رنگ کون سے مناسب ہوں گے۔ ملبوسات کے رنگوں تک کا خیال اس لیے رکھا گیا کہ ٹی وی سکرین پر اگر تم سفید کپڑے پہن کر آ جاؤ تو انسان کی بجائے بھوت پریت زیادہ لگتے ہو۔ بہرحال یہ ہے وہ انتخابی مہم جو امریکیوں کو جمہوریت کی بنیادوں پر ہونے والے صدارتی انتخابات میں حصہ لینے کی ترغیب دینے اور اپنے لیے ووٹ ڈالنے پر اکسانے کے لیے چلائی جاتی ہے۔

ایک آدمی' اگر بہت اچھا مقرر ہے اور اپنی جادو بیانی سے سامعین کو مسحور کر کے رکھ دیتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ بہت اچھا ریاستی کارندہ بھی ثابت ہو سکے گا۔ اگر کوئی انتہائی لذیذ کھانا پکانے میں مہارت رکھتا ہے تو یہ مہارت اس بات کی دلیل ہرگز نہیں ہے کہ وہ حکومتی معاملات کو عوامی امنگوں کے مطابق سنبھالنے کی لیاقت بھی رکھتا ہے۔

جب ابراہم لنکن امریکہ کا صدر بنا تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ سینٹ میں اپنی افتتاحی تقریر کا آغاز کرنے والا تھا۔ بہت سے ارکان خود کو ناراض اور دکھی محسوس کر رہے تھے کیونکہ لنکن کا باپ ایک چمار تھا اور ایک چمار کے بیٹے نے بہت اعلیٰ ذات سے تعلق رکھنے والے مخالف امیدوار کو چاروں شانے چت کر دیا تھا۔ اس بات نے سینٹ کے ''معزز ارکان'' کو بہت دل شکستہ کر دیا تھا۔ ایک مغرور امیر زادہ یہ منظر برداشت نہ کر سکا اور اس سے پہلے کہ ابراہم لنکن اپنی تقریر شروع کرے وہ کہنے لگا ''ایک منٹ ٹھہرو۔'' پھر کھڑا ہوا اور بولا: ''کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟ تم کبھی کبھار اپنے باپ کے ساتھ میرے گھر آیا کرتے تھے کیونکہ تمہارا باپ میرے خاندان کی جوتیاں تیار کیا کرتا تھا اور تم اس کی مدد کیا کرتے تھے۔'' یہ سن کر امریکی سینٹ کے تمام ''معزز ارکان'' دل کھول کر ہنسے۔ دراصل یہ لنکن کو ذلیل کرنے کی ایک بھونڈی کوشش تھی۔

لیکن ابراہم لنکن جیسے لوگوں کو کوئی ذلیل نہیں کر سکتا۔ جواباً اس نے کہا تھا ''میں آپ کا بے حد شکرگزار ہوں کہ اس اہم موقع پر آپ نے مجھے میرے مرحوم باپ کی یاد دلا دی۔ میرے باپ علاقے کے معروف چمار تھے اور یہ میں خوب جانتا ہوں کہ وہ جتنے اچھے چمار تھے میں اتنا اچھا امریکی صدر کبھی نہیں بن سکوں گا۔ میں اب بھی اُن سے کمتر ہوں۔''

کیا لنکن جیسے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے عظیم آدمیوں کی تحقیر اور اہانت ہی جمہوریت ہے؟ آخر جمہوریت کی کسوٹی کیا ہے؟ اس بے چہرہ نظام کے خدوخال بتا سکتے ہو؟

اسی لیے میں کہتا ہوں کہ جمہوریت کے دن گنے جا چکے ہیں' اب ایک نئے عالمی نظام کی ضرورت ہے جو قابلیت اور اہلیت کی بنیادوں پر استوار ہو۔ دنیا بھر میں ہزاروں یونیورسٹیاں ہیں' جن سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے کروڑوں لوگ اسی دھرتی پر موجود ہیں۔ ایسے میں جاہل آبادی کو نااہل لوگوں کے انتخاب کا حق نہیں دیا جانا چاہیے۔ چند لوگوں کو پانچ سال تک بے پناہ طاقت تفویض کرنے کا اختیار لاتعداد جاہلوں کے پاس رہنا چاہیے یا نہیں؟ ہرگز نہیں رہنا چاہیے۔ جاہلوں کے ذریعے منتخب ہونے والے اب اس قدر مقتدر ہو گئے ہیں کہ ایک اشارے سے دنیا کے چپے چپے کو تباہ و برباد کر سکتے ہیں' لہٰذا ایک نئے نظام کی ضرورت جتنی اب ہے' پہلے شاید کبھی نہ تھی۔

قابل شاہی یا اہل لوگوں کی حکومت کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے جس شعبے کی تعلیم و تربیت پائی ہو' انہیں اسی شعبے کے لیے ووٹ دینے کا حق ہو گا۔ مثال کے طور پر وزیر تعلیم کو ماہرین تعلیم اور عالم و فاضل لوگ منتخب کریں گے اور اُن کا چنا ہوا وزیر تعلیم یقیناً موزوں ترین اور صلاحیتوں کے حوالے سے اپنے شعبے میں سب پر فائق تسلیم کیا جائے گا۔ اسی طرح وزیر اقتصادیات کے طور پر ایسا شخص منتخب کیا جانا چاہیے جو اقتصادی امور کے جملہ نشیب و فراز سے خوب آگاہ ہو لیکن یہ آدمی انہی لوگوں کے ذریعے منتخب کیا جائے جو اقتصادیات کے علم سے بہرہ ور ہوں۔

وزیر صحت ان تمام اطباء' ہومیوپیتھس' ڈاکٹروں اور ویدوں کے ووٹوں کے ذریعے منتخب کیا جانا چاہیے جو طبی شعبے میں عملی خدمات بھی انجام دے رہے ہوں۔ پوری کی پوری قابل شاہی اسی طرح قائم ہو گی' یوں ہم اپنے قابل فخر لوگوں کے حقیقی جوہر سامنے لا سکیں گے۔ یہ منتخب لوگ واقعتاً اربوں لوگوں کا حقیقی جوہر ہوں گے اور انسانی زندگی کو پرسکون' پرامن اور نہایت ترقی یافتہ بنانے میں کامیاب رہیں گے۔

قابل شاہی نظام کے تحت تمہارے چنے ہوئے قابل ترین لوگ بعدازاں صدر یا وزیراعظم کا چناؤ کریں گے' وہ تمہاری نمائندگی کرتے ہوئے ان دونوں مناصب کے لیے عوام میں سے بھی لائق افراد منتخب کرنے کا حق رکھتے ہیں اور پارلیمان کے دو فاضل ترین ممبروں کو بھی یہ عہدے سونپ سکتے ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں؟ یہ ان کی صوابدید اور حالات کے تقاضوں پر منحصر ہوگا۔

پارلیمان کے ممبروں کے انتخاب کے لیے بھی ہمیں ایک درجہ بندی کی ضرورت ہوگی مثلاً قابل شاہی نظام میں پارلیمانی انتخابات میں صرف وہ لوگ ووٹ دے سکیں گے جو ایم اے یا کم از کم بی اے کی ڈگریاں رکھتے ہوں۔ اکیس سال کی عمر کو پہنچ جانے سے ہی تم قابل افراد کے انتخاب میں رائے دینے کے حقدار نہیں ہوجاتے۔ میرے خیال میں تو ایک اکیس سالہ ان پڑھ نوجوان کو زندگی اور زندگی کی الجھنوں کے بارے میں خاک بھی پتہ نہیں ہوتا لہٰذا جو لوگ پارلیمان کے ممبروں کو منتخب کریں ان کے لیے لازم ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔

عالمگیر حکومت کے قیام سے قبل ہر ریاست کو قابل شاہی دور سے گزرنا چاہیے۔ اگر عوام نے ایک بار قابل شاہی کو قبول کرلیا تو وہ جلد ہی جان جائیں گے کہ پورے کرۂ ارض پر ایک عالمگیر حکومت قائم کرنے کے نتیجہ میں زندگی واقعتاً خوبصورت اور پرلطف ہوجائے گی' ہر طرف امن اور سکھ چین کا دور دورہ ہوگا' ایسے میں کوئی ترک دنیا پر آمادہ نہیں ہوگا بلکہ ہر کوئی زندگی کی راحتوں کو دنیا میں رہتے ہوئے پانا چاہے گا۔

اب تک جو بھی ہوا ہے وہ یوگنگی اور یکجائی کی انسانی تمنا کے برعکس ہوا ہے۔ پوری انسانی تاریخ تخریبی سرگرمیوں اور حادثات و سانحات کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔

ہمیں یہ خوفناک عمل روکنا پڑے گا' تاریخ کا دھارا بدلنا ناگزیر ہو چکا ہے' اب یہ طے کرنا ہوگا کہ مستقبل کی ساخت و ہیئت کسی انسان دشمن طاقت کے ہاتھوں تشکیل نہیں پائے گی اور نہ ہی ہم ایسا مصنوعی مستقبل قبول کریں گے اور آج یہ عہد بھی کرنا ہوگا کہ آنے والا دور ہم خود تخلیق کریں گے۔ یاد رکھو! ہماری دنیا کی نئے انداز میں تخلیق ممکنہ طور پر سب سے بڑی تخلیق ہوسکتی ہے۔

❀ ❀ ❀

ضمیمہ: 1

انسانی حقوق کیلئے عالمی برادری کا متفقہ اعلان

(مجلس عظمیٰ کی طرف سے مورخہ 10 دسمبر 1948ء کی قرارداد نمبر (111) A 217 کے ذریعے یہ اعتراف و اعلان جاری اور منظور کیا جاتا ہے)

تمہید

کیونکہ تمام انسان ایک خاندان کی طرح ہیں اور اس خاندان کے ہر فرد کا فطری فخر واحترام اور اس کے جملہ حقوق کا تسلیم کیا جانا عالمی آزادی' انصاف اور امن کی اساس ہے'

کیونکہ انسانی حقوق کے حوالے سے پائی جانے والی توہین آمیز بے حسی کا سبب وہ جنگلی' غیر مہذب اور وحشیانہ سرگرمیاں ہیں جن کے باعث انسانیت کے ضمیر کو سخت ٹھیس لگی ہے۔ ایک ایسی دنیا کی تخلیق کے لیے' جہاں انسان عقاید و افکار کی مکمل آزادی سے لطف اندوز ہوسکیں گے نیز ہر طرح کے خوف و ہراس اور تعصبات سے نجات کے لیے' عام انسان کی عظیم ترین تمناؤں کی صورت میں یہ اعلان کیا جاتا ہے'

کیونکہ یہ ضروری ہے کہ انصاف پسند حکومتوں کے ذریعے انسانی حقوق کی حفاظت کو یقینی بنایا جائے تاکہ ناانصافی اور ظلم کے خلاف بغاوت میں آخری انتخاب کی صورت میں کسی آدمی کو خود ساختہ جلاوطنی یا پناہ لینے پر مجبور نہ ہونا پڑے'

کیونکہ یہ بے حد ضروری ہے کہ دنیا بھر کی ریاستوں کے مابین دوستانہ نوعیت کے روابط کو تیزی سے فروغ دیا جائے'

کیونکہ انجمن اقوام متحدہ کے ممالک کی عوام نے اس اعلان میں شامل انسانی حقوق' انسانی ذہانت و وقار اور مرد و زن کے مساوی حقوق کے حوالے سے اپنی مثبت تمنا کی تصدیق و توثیق کی ہے نیز سماجی استحکام اور بھرپور آزادی کے ذریعے عظیم سے عظیم تر طرز حیات کی

فروغ پذیری کے لیے مصمم ارادہ ظاہر کیا ہے

کیونکہ مجلس ہذا میں حاضر ممالک نے ازخود ہی یہ حلف اٹھایا ہے کہ وہ انجمن اقوام متحدہ کے ساتھ بھرپور تعاون کرتے ہوئے انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کی تعمیل اور اس غرض سے عالمی برادری کے باہمی بھائی چارے کے قیام کا ہدف حاصل کرنے کے لیے سرتوڑ جتن کریں گے

کیونکہ مذکورہ بالا حلف کو صحیح معنوں میں عملی شکل دینے کے لیے ان حقوق اور آزادیوں کی متفقہ عالمی تفہیم سب سے زیادہ اہم نکتہ ہے

لہٰذا مجلس عظمیٰ کرۂ ارض کے ممالک کی غیر مشروط اور بھرپور حمایت سے ایک متفقہ عالمی پیمانے کی صورت میں تمام افراد اور تمام حکومتوں کے ذریعے قابل تعمیل انسانی حقوق کا اعلان کرتی ہے آخرکار ہر انسان اور سماج کا ہر طبقہ اس اعلان کو مسلسل ایک قابل حصول ہدف کی صورت میں اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہوئے اس میں درج حقوق اور آزادیوں کے لیے انسانی احترام اور بین الفردی روابط کی مثبت استواری کے لیے اور تعلیم و ترقی کے فروغ کے لیے انتھک جدوجہد کرے گا۔ علاوہ ازیں وہ رکن ممالک کی عوام اور ان کے طفیلی خطوں کی حدود میں مقیم لوگوں سے اس متفقہ عالمی اعلان کو مؤثر انداز میں تسلیم کروانے اور پھر اس کی تعمیل کے لیے تعمیری اقدامات کا راستہ اختیار کرے گا۔

▶▶ ▶▶ ▶▶

شق:1

تمام انسان پیدائشی طور پر آزاد ہیں۔ وہ شخصی احترام اور حقوق میں مساوی ہیں۔ وہ عقل و ضمیر کے زیور سے آراستہ ہیں لہٰذا انہیں ایک دوسرے کے لیے بھائی چارے کے جذبے کے تحت مصروف عمل ہونا چاہیے۔

شق:2

اس اعلان میں طے کردہ تمام حقوق اور آزادیاں ہر شخص کے لیے ہیں۔ اس حوالے سے درج ذیل یا اسی طرح کے دوسرے اسباب کی بنا پر کسی کو کسی پر فوقیت نہیں ہوگی:

مثلاً رنگ، نسل، جنس، زبان، مذہب، سیاسی و غیر سیاسی نیز ہر طرح کے افکار و تصورات، ریاستی یا سماجی حوالے نجی جائیداد اور جائے پیدائش یا عہدہ وغیرہ۔

علاوہ ازیں کسی بھی فرد کے ملک یا خطے کے سیاسی یا دستوری انتظام یا بین الاقوامی حیثیت کے حوالے سے کوئی فرق یا امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا، چاہے وہ ملک یا خطہ آزاد ہو، طفیلی ہو، مقبوضہ ہو یا قدرتی حد بندی کا حامل ہو۔

شق:3

ہر انسان کو آزادیٔ حیات اور انسانی تحفظ کا حق حاصل ہے۔

شق:4

کسی کو بھی بیگاری یا غلامی میں نہیں دھکیلا جا سکتا لہٰذا بیگار اور غلامی کا کاروبار اپنی تمام صورتوں میں ممنوعہ سرگرمی تصور کیا جائے گا۔

شق:5

کسی بھی انسان کو بے رحمی یا ظلم کا نشانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اور نہ ہی کسی سے غیر انسانی یا توہین آمیز رویہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ کسی کو ایسی سزا بھی نہیں دی جا سکتی جو بے رحمی، ظلم یا اہانت کے زمرے میں آتی ہو۔

شق: 6

سب کو قانون کی نظروں میں ایک انسان کی حیثیت سے تعظیم پانے کا حق حاصل ہے۔

شق: 7

قانون کی نظروں میں سب برابر ہیں اور تمام انسان بغیر کسی اختلاف و امتیاز کے قانونی تحفظ اور امداد لینے کے حقدار ہیں۔ اس اعلامیے کی خلاف ورزی تصور کیے جانے والے کسی امتیاز یا اشتعال انگیز کارروائی کے خلاف بھی ایک جیسی محافظت حاصل کرنے کے بھی حقدار ہیں۔

شق: 8

ہر انسان کو دستور یا قانون کے ذریعے ملے بنیادی حقوق کے خاتمے کی صورت میں مجاز ریاستی عدالتوں کے ذریعے مؤثر انصاف کے حصول کا حق حاصل ہے۔

شق: 9

کسی بھی انسان کو من مانی کے سے انداز میں گرفتار، محبوس یا جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔

شق: 10

ہر انسان کو اس کے حق اور فرض کے تعین کے لیے اور اس کے خلاف عائد فردِ جرم کے فیصلے کے لیے آزاد اور غیر جانبدار عدالت کے روبرو مساوی سطح پر انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق اپنے مقدمے کی عام سماعت کا حق حاصل ہے۔

شق: 11

(1) ہر اُس انسان کو، جس پر کسی قابل سزا جرم کا الزام عائد کیا جائے، یہ حق حاصل ہے کہ اسے تب تک بے قصور تصور کیا جائے جب تک اسے قانون کے ذریعے مقدمے کی کارروائی کی مدد سے مجرم قرار نہ دیا جائے، جس میں اُسے اپنے دفاع کے لیے تمام ضروری اقدامات کی ضمانت بھی دی گئی ہو۔

(2) کسی بھی آدمی کو اُس کے کسی بھی عمل یا لغزش کی پاداش میں تب تک قابل سزا جرم کا مرتکب نہیں ٹھہرایا جا سکتا جب تک کہ وہ عمل اس وقت کسی ریاستی یا بین الاقوامی قانون کے تحت جرم نہ ہو، جب اسے کیا گیا تھا۔ نیز نہ ہی اُسے جرم کے وقت لاگو سزا سے زیادہ یا جرم

سے بڑی سزا دی جائے گی۔

شق: 12

کسی بھی شخص کے ذاتی امور، گھر، خاندان یا خط و کتابت میں من مانی کے سے انداز میں دخل نہیں دیا جائے گا۔ نیز نہ ہی اس کے اعزاز اور شہرت کو کوئی ٹھیس پہنچائی جائے گی بصورت دیگر اس قسم کی دخل اندازی یا ارادے کے خلاف قانونی تحفظ کا حصول ہر شخص کا حق ہے۔

شق: 13

(1) ہر شخص کو ہر ریاست کی سرحد کے اندر کسی بھی جگہ آمد و رفت اور قیام کا حق حاصل ہے۔

(2) ہر کسی کو اپنے ملک سمیت کسی بھی ملک کو چھوڑنے نیز اپنے وطن واپس جانے کا حق حاصل ہے۔

شق: 14

(1) ہر انسان کے پاس خود کو ستائے جانے پر دوسرے ملک سے پناہ طلب کرنے اور اس کا فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

(2) لیکن اس حق کا استعمال غیر سیاسی جرائم یا ایسے معاملات میں نہیں کیا جائے گا جو انجمن اقوام متحدہ کے اصول و ضوابط کے برعکس ہوں۔

شق: 15

(1) ہر شخص کو شہریت پانے کا حق حاصل ہے۔

(2) کسی کو بھی من مانی کرتے ہوئے اس کے حق شہریت سے محروم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی شہریت کی تبدیلی کی شخصی خواہش کی تکمیل کے عمل میں رکاوٹیں کھڑی کی جا سکتی ہیں۔

شق: 16

(1) بالغ ہو چکے مرد و زن کو بغیر کسی ذات، شہریت یا مذہب کی پابندی کے شادی کرنے اور خاندان تشکیل دینے کا حق حاصل ہے۔

(2) خواہشمند جوڑوں کی آزادانہ اور مستحکم باہمی رضامندی کے بعد ہی شادی کا سرکاری اندراج کیا جائے گا۔

(3) خاندان سماج کی قدرتی' بنیادی اور غیر منتشر اکائی ہے اور اسے سماجی یا حکومتی تحفظ کے حصول کا حق حاصل ہے۔

شق: 17

(1) ہر انسان کو اکیلے اور کسی کی شراکت کے ساتھ جائیداد رکھنے کا حق حاصل ہے۔

(2) کسی کو بھی اس کی جائیداد سے جبراً محروم نہیں کیا جائے گا۔

شق: 18

ہر انسان کے پاس افکار و نظریات' ضمیر اور مذہب کی آزادی کا حق ہے' اسی حق میں اپنا مذہب یا عقیدہ بدلنے کی آزادی بھی شامل ہے۔ نیز ہر کسی کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ تنہا یا دیگر افراد کی معیت میں' اجتماع یا محفل میں' مشترکہ یا نجی طور پر اپنے مذہب یا اعتقادات و تعلیمات کو ظاہر کرے' اُن پر کاربند رہے اور مذہبی عبادات و معمولات کی پابندی کرے۔

شق: 19

ہر انسان کو اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق کے تحت ہر شخص کوئی بھی عقیدہ یا نظریہ اپنا سکتا ہے' نیز سرحدوں کے کسی بھی اختلاف و امتیاز کے بغیر ہر کوئی ہر طرح کے ذرائع ابلاغ کے ذریعے اطلاعات و آراء تلاش کر سکتا ہے' حاصل کر سکتا ہے اور اسی طرح فراہم بھی کر سکتا ہے۔

شق: 20

(1) ہر انسان کو پرامن مجالس کے قیام و انعقاد اور دوسرے انسانوں سے میل جول کا حق حاصل ہے۔

(2) کسی کو بھی کسی تنظیم کا رکن بننے پر مجبور نہیں کیا جا سکے گا۔

شق: 21

(1) ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں' براہ راست اور آزادانہ طور سے' منتخب نمائندگان کے ذریعے حصہ لینے کا حق حاصل ہے۔

(2) ہر شخص کو اس کے ملک میں عوامی خدمات یکساں طور پر حاصل ہوں گی۔ عوامی رائے' حکومت کے حق کی بنیاد ہوگی۔ عوامی رائے کا اظہار طے شدہ وقت اور داخلی انتخابات

کے ذریعے ہوگا جو رائے دہندگی کے یکساں حق کے ذریعے خفیہ رائے شماری' یا یکساں رائے دہندگی کی کسی اور مستحکم روایت کی مدد سے انجام پائیں گے۔

شق: 22

سماج کے ایک رکن کی حیثیت سے ہر کسی کو اُس کی شخصی توقیر کو یقینی بنانے کے لیے ضروری معاشی' معاشرتی اور ثقافتی حق حاصل ہوں گے نیز شخصی خوبیوں کے آزادانہ فروغ کے لیے ہر آدمی کو سماجی تحفظ کا حق حاصل ہے۔ یہ حق اسے ریاستی کوششوں' بین الاقوامی تعاون اور دیگر تمام ذرائع کی بدولت حاصل ہوگا۔

شق: 23

(1) ہر انسان کو زندہ رہنے کا' آزادانہ طور پر پیشے کے انتخاب کا' کام کے لیے منصفانہ طور پر تمام جہتیں کھلی پانے کا اور بیروزگاری کے خلاف کفالت حاصل کرنے کا حق ہے۔

(2) ہر انسان کو بلاامتیاز ایک جیسے کام کے لیے ایک جیسی تنخواہ لینے کا حق حاصل ہے۔

(3) ہر انسان کو' جو محنت کرتا ہے' منصفانہ طور پر مکمل معاوضہ پانے کا حق ہے تاکہ وہ اپنی اور اپنے خاندان کی زندگی سے انسانی عظمت و توقیر کے ساتھ باعزت انداز میں لطف اندوز ہو سکے۔ اگر ضرورت ہو تو اس کے سماجی تحفظ کے لیے دیگر متعلقہ اقدامات بھی کیے جائیں۔

(4) ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے مزدور تنظیمیں بنائے یا ایسی تنظیموں میں شمولیت اختیار کرے۔

شق: 24

ہر شخص کو آرام کرنے اور تفریحی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا حق حاصل ہے' اس میں اوقات کار کے مقررہ گھنٹوں کی حد اور مخصوص دورانیہ گزرنے کے بعد چھٹی کا حق بھی شامل ہے۔

شق: 25

(1) ہر ایک انسان کو اس کی اپنی اور اس کے خاندان کی صحت و تندرستی اور فلاح و بہبود کے لیے ایک باسہولت زندگی کا مطلوبہ معیار پانے کا حق حاصل ہے۔ اس میں غذا' ملبوسات' گھر اور صحت کی سہولیات کے علاوہ دیگر بہت سی سماجی خدمات کی فراہمی بھی شامل ہے۔ نیز ہر کسی کو بیروزگاری' بیماری' معذوری' بیوگی' بڑھاپے اور اسی طرح کی اُن دیگر صورتوں

سے' جو انسانی قابو سے باہر ہیں' تحفظ حاصل کرنے کا حق بھی حاصل ہے۔

(2) زچہ و بچہ خصوصی دیکھ بھال اور امداد کے حقدار ہیں۔ تمام بچے چاہے وہ شادی شدہ ماں باپ کی اولاد ہوں یا غیر شادی شدہ جوڑوں سے پیدا ہوئے ہوں' یکساں سماجی محافظت کے حقدار ہیں۔

شق: 26

(1) ہر انسان کو تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے۔ کم از کم ابتدائی تعلیم مفت دی جائے گی۔ ابتدائی تعلیم ہر کسی کے لیے لازمی قرار دی جاتی ہے۔ تکنیکی اور اقتصادی علوم کی پڑھائی کا سب کے لیے یکساں اہتمام ہوگا اور اعلیٰ تعلیم کے مواقع لیاقت' اہلیت اور ذہانت کی بنیاد پر سب کے لیے یکساں طور پر موجود ہوں گے۔

(2) تعلیم انسان کی شخصیت کی بھرپور تکمیل' انسانی حقوق کی پاسداری اور بنیادی آزادیوں کے لیے احترام کو پختہ کرنے کی جہات میں دی جائے گی۔ نیز تعلیم تمام ممالک' نسلوں یا مذاہب کے مابین افہام و تفہیم' برداشت' رواداری اور دوستانہ تعلقات کو فروغ دے گی اور ساتھ ہی دنیا میں قیام امن کے لیے انجمن اقوام متحدہ کی کوششوں کو آگے بڑھائے گی۔

(3) ماں باپ کو اپنے بچوں کے لیے پڑھائی کی نوعیت طے کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

شق: 27

ہر ایک آدمی کو اجتماعی معاشرتی زندگی میں آزادانہ طور پر حصہ لینے کا جملہ فنون سے لطف اندوز ہونے کا اور علمی و سائنسی پیش رفت اور اس کے ثمرات میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے۔

شق: 28

ہر انسان کو ایک ایسی سماجی اور بین الاقوامی فضا یا ماحول پانے کا حق حاصل ہے جس میں اس اعلامیے میں درج حقوق اور آزادیاں اسے بطریق احسن مل سکیں۔

شق: 29

(1) ہر ایک انسان کے' اجتماع' یا معاشرے کے لیے کچھ فرائض ہیں جن کی انجام دہی سے اس کی شخصیت کی بھرپور نشوونما ممکن ہوتی ہے۔

(2) ہر انسان کو اپنے حقوق اور آزادیوں کا استعمال صرف انہی حد بندیوں کے اندر رہتے ہوئے کرنا ہوگا جو قانون کے ذریعے دوسروں کے حقوق اور آزادیوں کے اعتراف اور احترام کو یقینی بنانے اور جمہوری سماج کی نیک نامی' عالمی امن اور دنیا کی فلاح و بہبود اور ترقی کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔

❀ ❀ ❀

ضمیمہ: 2

اوشو کا مختصر زندگی نامہ [1]

پیدائش اور بچپن:

عقیدت مندوں کے حلقے میں وہ ''بھگوان شری رجنیش'' کہلاتا ہے' کچھ لوگ اُسے ''اوشو'' کے نام سے یاد کرتے ہیں جبکہ باقی دنیا گرو رجنیش یا صرف رجنیش کہنے پر اکتفا کرتی ہے۔ لاکھوں لوگوں کو عجیب و غریب نیم روحانی تصورات میں اسیر کر دینے والا یہ شخص مدھیہ پردیش (بھارت) کی ایک چھوٹی سی بستی کچھواڑا میں 11 دسمبر 1931ء کو پیدا ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنی جائے ولادت کو وہ کبھی فراموش نہ کر سکا اور کچھواڑا کی ننھی سی بستی ہمیشہ اس کے دل میں آباد رہی۔ وہ کہتا ہے:

مجھے وہ بستی یاد ہے جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ ہستی نے اس بستی کو کیوں منتخب کیا اس کی وضاحت نہیں کی جا سکتی ہے۔ یہ ویسے ہی ہوا جیسا اسے ہونا چاہیے تھا۔ وہ بستی خوبصورت تھی۔ میں نے کافی سفر و سیاحت کی ہے لیکن میں ویسی خوبصورتی کہیں نہیں پا سکا۔ کوئی انسان کبھی ایک سی چیز نہیں پاتا ہے۔ چیزیں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں لیکن یہ کبھی ایک سی نہیں ہوتی ہیں۔ میں اس خاموش چھوٹی سی بستی کو دیکھ سکتا ہوں۔ ایک تالاب کے گرد چند ایک جھونپڑے اور چند ایک لمبے لمبے درخت جن کے نیچے میں کھیلا کرتا تھا۔ بستی میں کوئی سکول نہیں تھا۔ یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ میں لگ بھگ نو سال تک غیر تعلیم یافتہ ہی رہا اور وہ انتہائی تشکیلی برس تھے۔ اس کے بعد چاہے تم کوشش بھی کر لو تم تعلیم یافتہ نہیں ہو سکتے۔ پس ایک اعتبار سے میں اب بھی غیر تعلیم یافتہ ہی ہوں' گو کہ میں نے کئی ڈگریاں حاصل کی ہوئی ہیں...... اور صرف کوئی ڈگری ہی نہیں بلکہ ایک فرسٹ کلاس ڈگری۔ کوئی بھی احمق ایسا

---

[1] قارئین! اوشو کی زندگی کے حوالے سے تفصیلی معلومات کا حصول مقصود ہو تو ''ایک روحانی گمراہ صوفی کی آپ بیتی'' مطالعہ فرمائیں۔ ترجمہ: محمد احسن بٹ۔ مطبوعہ ''نگارشات'' 24۔ مزنگ روڈ لاہور۔

کرسکتا ہے' ہر سال بہت سے احمق ایسا کرتے ہیں حالانکہ اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی ہے۔ جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ اپنے ابتدائی برسوں میں میں غیر تعلیم یافتہ ہی رہا۔ وہاں کوئی سکول نہیں تھا' کوئی سڑک' کوئی ریلوے' کوئی ڈاک خانہ نہیں تھا۔ کیسی نعمت ہے! وہ بستی اپنی جگہ ایک دنیا تھی۔ حتیٰ کہ اس بستی سے دور بیتے ایام میں بھی میں اسی دنیا میں رہا ہوں' غیر تعلیم یافتہ اور میں لاکھوں لوگوں سے ملا ہوں لیکن اس بستی کے لوگ ہر کسی سے زیادہ معصوم تھے' اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت ابتدائی تھے۔ وہ دنیا کی کسی شے کے بارے میں نہیں جانتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک اخبار بھی کبھی اس بستی میں نہیں آیا تھا ۔ کیسی نعمت تھی!

اگرچہ اوشو کا باپ کپڑے کا ایک عام تاجر تھا لیکن اس کی دکان خوب چلتی تھی لہذا روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ باپ کا خیال تھا کہ بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے اوشو اس کا کاروباری جانشین بنے گا مگر باپ اور دکان سے اُسے سخت چڑ تھی۔ وہ خود کہتا ہے:

میرے باپ کی دکان اس گھر کے سامنے تھی جہاں خاندان رہا کرتا تھا۔ ہندوستان میں ایسا ہی ہوتا ہے: گھر اور دکان ساتھ ساتھ ہوتے ہیں سو آسانی سے انتظام ہو سکتا ہے۔ میں اپنے باپ کی دکان کے قریب سے آنکھیں بند کر کے گزرا کرتا تھا۔

اس نے مجھے کہا ''یہ انوکھی بات ہے۔ جب بھی تم دکان سے گزر کر جاتے ہو یا گھر سے جاتے ہو'___ وہ فاصلہ صرف بارہ گز کا تھا_ ''تم ہمیشہ اپنی آنکھیں بند رکھتے ہو۔ تم کس رسم پر عمل کرتے ہو؟''

میں نے کہا ''میں تو بس اس لیے ایسا کرتا ہوں تا کہ آپ کی دکان مجھے تباہ نہ کر دے جیسا اس نے آپ کو تباہ کر دیا ہے۔ میں تو اس کو دیکھنا بھی نہیں چاہتا ہوں' میں مطلق طور پر دلچسپی نہیں رکھتا ہوں' کوئی دلچسپی نہیں ہے مجھے'' اور وہ اس شہر کی سب سے زیادہ خوبصورت کپڑے کی دکانوں میں سے ایک تھی _ وہاں بہترین کپڑا دستیاب ہوتا تھا__ لیکن میں نے کبھی اس طرف نہیں دیکھا' میں تو بس آنکھیں بند کرتا اور پاس سے گزر جاتا تھا۔

اس نے کہا: ''لیکن آنکھیں کھولے رکھنے میں تمہارا کوئی نقصان نہیں ہے۔''

میں نے کہا: ''انسان کبھی نہیں جانتا ہے_ انسان کو ورغلایا جا سکتا ہے۔ میں کسی شے سے بھی ورغلایا جانا نہیں چاہتا ہوں۔''

میں اس کا سب سے بڑا بیٹا تھا' فطری طور پر وہ چاہتا تھا کہ میں اس کی مدد کروں۔ وہ چاہتا تھا کہ تعلیم کے بعد میں آؤں اور دکان کا کام کاج سنبھال لوں۔ اس نے خوب انتظام کیا تھا' دکان رفتہ رفتہ ایک ''بڑی دکان'' بن گئی تھی۔ اس نے کہا ''اس کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ میں بوڑھا ہو جاؤں گا' کیا تم چاہتے ہو کہ میں ہمیشہ ہمیشہ یہاں رہوں؟''

میں نے کہا: ''نہیں' میں ایسا نہیں چاہتا تاہم آپ سبک دوش (ریٹائر) ہو سکتے ہیں۔ آپ کے چھوٹے بھائی ہیں' جو دکان میں دلچسپی بھی لیتے ہیں' بلکہ بہت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں__ یہاں تک کو وہ خوف زدہ ہیں کہ کہیں آپ دکان مجھی کو نہ دے دیں۔ میں نے انہیں بتا دیا ہے: ''مجھ سے خوف زدہ مت ہو' میں کسی سے مقابلہ نہیں کر رہا ہوں'۔ یہ دکان اپنے چھوٹے بھائیوں کو دے دیجیے۔''

لیکن ہندوستان میں روایت یہ ہے کہ سب سے بڑا بیٹا ہی ہر شے کا وارث ہوتا ہے میرا باپ اپنے باپ کا سب سے بڑا بیٹا تھا' اسے ہر شے وراثت میں ملی۔ جو کچھ اس کے پاس تھا اب اس کی دیکھ بھال میرے ذمے تھی۔ فطری طور پر وہ فکر مند تھا' مگر ادھر کوئی راستہ نہیں تھا۔

وہ ایک جین خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس کے لگ بھگ بھی افراد جینی عقائد پر سختی سے کاربند تھے۔ یوں آنکھیں کھولتے ہی اسے ایک کٹر مذہبی ماحول کا سامنا تھا۔ ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے بعد ازاں اوشو نے بتایا:

جین مت دنیا کا سب سے زیادہ تارک الدنیا دھرم ہے یا دوسرے لفظوں میں سب سے زیادہ مسا کیت پسند اور سادیت پسند۔ جین درویش اپنے اوپر اتنا تشدد کرتے ہیں کہ انسان حیرت سے کہتا ہے کہ کیا یہ لوگ پاگل ہیں۔ وہ پاگل نہیں ہوتے ہیں۔ وہ تو بیوپاری ہوتے ہیں اور جین درویشوں کے پیروکار سب بیوپاری ہوتے ہیں حیرانی کی بات ہے کہ ساری جین برادری بیوپاریوں پر مشتمل ہے..... لیکن حقیقت میں حیرانی کی بات نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دھرم بذاتِ خود بنیادی طور پر دوسری دنیا میں منافع سے تحریک پاتا ہے۔ جین خود پر اس لیے تشدد کرتا ہے تا کہ جو کچھ وہ اس دنیا میں نہیں پا سکتا ہے' اُسے دوسری دنیا میں حاصل کر لے۔ میری عمر اُس وقت چار یا پانچ برس ہو گی جب پہلی بار میں نے اپنی نانی کے گھر بلائے گئے جین درویش کو دیکھا۔ میں ہنسی نہیں روک سکا تھا۔ میرے نانا نے مجھے کہا: ''خاموش رہو! میں جانتا ہوں تم شرارتی ہو۔ اگر تم پڑوسیوں کے لیے دردِ سر ہو تو میں تمہیں معاف کر سکتا ہوں لیکن اگر تم نے میرے گرو کے ساتھ شرارت کی تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔ وہ میرا آقا ہے' اس نے مجھے دھرم کے داخلی اسرار سے واقف کروایا ہے۔''

میں نے کہا: ''مجھے داخلی اسرار سے کوئی سروکار نہیں ہے' مجھے تو خارجی اسرار سے دلچسپی ہے جو وہ بہت واضح طور پر دکھا رہا ہے۔ وہ ننگا کیوں ہے؟ کیا وہ جانگیہ بھی نہیں پہن سکتا ہے؟''

میرا نانا بھی ہنسنے لگا۔ وہ بولا ''تم نہیں سمجھتے۔'' میں نے کہا: ''ٹھیک ہے' میں خود اسی سے پوچھ لوں گا۔''

جین درویش کے درشن کے لیے سارے بستی والے اکٹھے ہو گئے تھے۔ نام نہاد وعظ کے دوران میں مَیں کھڑا ہو گیا۔ یہ چالیس یا کچھ برس زیادہ پہلے کی بات ہے اور اس وقت سے میں مسلسل ان احمقوں کے ساتھ لڑ رہا ہوں۔ اس روز ایک ایسی جنگ کا آغاز ہوا جو صرف اس وقت ختم ہو گی جب میں زندہ نہیں ہوں گا شاید اس وقت بھی ختم نہ ہو یا ہو سکتا ہے میرے لوگ اسے جاری رکھیں۔

اوشو اپنے نانا اور نانی سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میرے نانا نے مجھے اپنی محبت اور مکمل آزادی دی جو اس کا بہت بڑا احسان ہے جبکہ اپنی نانی کو وہ ایک عظیم اور ناقابل فراموش عورت قرار دیتا ہے۔ ان دونوں بزرگوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:

وہ عورت حیرت ناک حد تک طاقت کی حامل قوت میں ڈھل سکتی تھی۔ اسے محض گھریلو عورت ہی نہیں رہنا چاہیے تھا۔ اسے اس چھوٹی سی بستی میں جینا نہیں چاہیے تھا۔ ساری دنیا کو اس سے واقف ہونا چاہیے تھا۔ شاید میں اسی کا وسیلہ ہوں یا شاید وہ مجھ میں حلول کر گئی ہے۔ اس نے مجھ سے اتنی محبت کی کہ میں نے اپنی حقیقی ماں کو کبھی حقیقی ماں نہیں سمجھا تھا۔ میں نے ہمیشہ اپنی نانی کو ہی اپنی حقیقی ماں سمجھا تھا۔

جب کبھی مجھے کسی شے کا اعتراف کرنا ہوتا تھا' کسی شخص کے ساتھ میں کوئی غلط حرکت کر بیٹھا ہوتا تھا تو میں کسی اور کے سامنے نہیں صرف اس کے سامنے اعتراف کرتا تھا۔ وہ میرا بھروسہ تھی۔ میں ہر شے کے لئے اس پر بھروسہ کر سکتا تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے ایک شے کا ادراک ہوا تھا اور وہ یہ تھی کہ وہ سمجھنے کی اہلیت رکھتی تھی۔

میں نے اپنی نانی سے زیادہ خوبصورت عورت کبھی نہیں دیکھی۔ میں خود بھی اس سے محبت کرتا تھا اور ساری زندگی اس سے محبت کرتا رہا ہوں۔ جب اسی (80) برس کی عمر میں وہ فوت ہوئی تو میں فوراً گھر کو دوڑا اور دیکھا کہ وہ لیٹی ہوئی ہے' مری ہوئی۔ وہ سب بس میرا ہی انتظار کر رہے تھے کیونکہ اس نے انہیں کہہ دیا تھا کہ اس کی ارتھی اس وقت تک نہیں اٹھائی جائے جب تک میں پہنچ نہیں جاتا۔ اس نے یہ اصرار کیا تھا کہ میں ہی اس کی ارتھی کو آگ دکھاؤں سو وہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں اندر گیا' اس کے چہرے سے کفن سرکایا......اور وہ اس وقت بھی خوبصورت تھی! حقیقت میں وہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی کیونکہ سب خاموش تھا' حتیٰ کہ اس کی سانسوں کی ہلچل' زندگی کی ہلچل وہاں نہیں تھی۔ وہ صرف ایک موجودگی تھی۔

اس کی ارتھی کو آگ دکھانا میری زندگی کا سب سے زیادہ مشکل کام تھا۔ یہ ایسے ہی تھا گویا میں لیونارڈو یا ونسنٹ وان گوگ کی سب سے زیادہ خوبصورت تصویروں (پینٹنگز) میں

سے ایک کو نذر آتش کر رہا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میرے لئے وہ ''مونالیزا'' سے زیادہ قیمتی تھی؛ وہ میرے لئے قلوپطرہ سے زیادہ خوبصورت تھی۔ یہ کوئی لفاظی نہیں ہے۔ میری نگاہ میں وہ سب جو خوبصورت ہے' اس کے وسیلے سے آتا ہے۔ اس نے ہر ہر طریقے سے مجھے ویسا ہونے میں مدد دی جیسا کہ میں ہوں۔

اور نانا محض ایک نانا ہی نہیں تھا۔ میرے لیے یہ واضح کرنا ایک دشوار امر ہے کہ وہ میرے لئے کیا تھا۔ وہ مجھے راجا کہا کرتا تھا راجا کا مطلب ہوتا ہے ''بادشاہ'' — اور ان سات برسوں میں اس نے مجھے کسی بادشاہ ہی کی طرح رکھا۔ میری سالگرہ کے دن وہ ایک قریبی قصبے سے ہاتھی لایا کرتا تھا — ان دنوں ہندوستان میں ہاتھیوں کو یا تو بادشاہ رکھا کرتے تھے — اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بہت مہنگا ہوتا ہے' انتظام' خوراک اور وہ خدمت جو ہاتھی کو مطلوب ہوتی ہے یا پنڈت رکھا کرتے تھے۔ دو ہی قسم کے لوگ انہیں رکھا کرتے تھے۔ پنڈت اس لئے ہاتھی رکھا کرتے تھے کیونکہ ان کے بہت زیادہ پیروکار ہوتے تھے۔ جیسے پیروکار پنڈت کی دیکھ ریکھ کرتے تھے ویسے ہی ہاتھی کی بھی دیکھ بھال کرتے تھے۔ نزدیک ہی ایک پنڈت ہاتھی رکھتا تھا سو میری سالگرہ کے دن میرا نانا مجھے ہاتھی پر دو تھیلوں کے ساتھ بٹھاتا تھا' ہاتھی کے دونوں پہلوؤں میں چاندی کے سکوں سے بھرے یہ تھیلے لٹکے ہوتے تھے۔

میرے بچپن کے ایام میں ہندوستان میں کرنسی نوٹ رائج نہیں ہوتے تھے' چاندی ہنوز روپے کی جگہ استعمال ہوا کرتی تھی۔ میرا نانا چاندی کے سکوں سے بھرے ہوئے دو تھیلے ہاتھی کے دونوں پہلوؤں میں لٹکا دیا کرتا تھا۔ میں ساری بستی کا چکر لگاتا تھا اور سکے لٹاتا جاتا تھا۔ اس طرح وہ سالگرہ منایا کرتا تھا۔ جب میں روانہ ہوتا تو وہ اپنی بیل گاڑی میں مزید سکے لیے میرے پیچھے پیچھے چلتا اور مجھے کہتا جاتا ''کنجوسی مت کرنا میرے پاس بہت سکے ہیں۔ جتنے زیادہ میرے پاس ہیں تم اس سے زیادہ لٹا نہیں سکتے ہو۔ چلو لٹانا شروع کر دو!''

وہ ہر ممکنہ طور پر اس بات کا بندوبست کرتا کہ میں خود کو کسی شاہی خاندان کا فرد تصور کروں۔ میں کئی اعتبار سے خوش قسمت ہوں لیکن میں اپنے نانا نانی کے حوالے سے سب سے زیادہ خوش قسمت ہوں۔

رجنیش نے اپنی عمر کے ابتدائی سات سال نانا نانی کے ہاں ہی گزارے۔ یہاں وہ جو چاہتا سو کرتا' کوئی روکنے ٹوکنے یا ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا۔ وہ کہتا ہے کہ ننھیالی عزیز سچائی کی تلاش میں میرا بہت بڑا سہارا بنے رہے اور میرے ذوقِ جستجو کو نکھارنے میں اُن کا کردار بہت اہم ہے۔ اوشو اپنے بچپن کے ان برسوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتا ہے:

میرے ذہن میں اپنے بچپن کے اولین برسوں میں اپنے باپ۔

ساتھ کسی تعلق کی کوئی یاد نہیں ہے' کیونکہ میں نے اپنی زندگی کے بالکل شروع کے برس دو بوڑھوں کے ہمراہ بسر کیے۔ اپنے نانا اور اس کے بوڑھے نوکر کے ساتھ' جو واقعتاً ایک خوبصورت انسان تھا' اور اپنی بوڑھی نانی کے ساتھ۔ میں مطلق طور پر تنہا تھا۔ وہ بوڑھے میرے رفیق نہیں تھے' نہ ہی میرے رفیق ہو سکتے تھے۔ اور میرا کوئی دوست نہیں تھا' اس کی وجہ یہ ہے کہ اس چھوٹی سی بستی میں میرا خاندان سب سے زیادہ امیر تھا اور وہ بستی اتنی چھوٹی تھی ...... کل ملا کر دو سو سے زیادہ لوگ نہیں تھے ...... اور اتنی غریب تھی کہ میرے نانا نانی نے مجھے بستی کے بچوں سے کھیلنے ملنے کی اجازت نہیں دی۔ وہ بچے گندے ہوتے تھے اور قریب قریب فقیر۔ پس وہاں دوست بنانے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اس بات نے بہت گہرا اثر مرتب کیا۔ اپنی ساری زندگی میں میں کسی شخص کو دوست کے طور پر نہیں جانتا ہوں۔ ہاں شناسا بہت ہیں۔

میں ان اولین برسوں میں اس قدر تنہا تھا کہ میں اس سے لطف اندوز ہونے لگا ...... اور وہ سچ مچ ایک خوشی تھی' مزا تھا' لطف تھا۔ پس وہ میرے لیے کوئی لعنت نہیں تھی وہ تو رحمت ثابت ہوئی۔ میں نے اس سے محظوظ ہونا شروع کر دیا اور مجھے خود اطمینانی کا احساس ہونے لگا' میرا کسی شخص پر انحصار جو نہیں تھا۔

اور میرے نانا نانی ایک بات سے بہت اچھی طرح آگاہ ہو گئے تھے کہ میں اپنی تنہائی سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔ انہوں نے دیکھا کہ میں بستی جا کر کسی سے ملنے کی خواہش نہیں رکھتا یا کسی سے بات کرنے کی آرزو نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ وہ مجھ سے گفتگو کی توقع کرتے جبکہ میں صرف ہاں اور نہیں میں ان کی باتوں کا جواب دیا کرتا تھا۔ میں کسی سے بات کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ وہ ایک بات سے آگاہ ہو گئے تھے کہ میں اپنی تنہائی سے لطف اندوز ہوتا ہوں اور انہوں نے اپنا مقدس فرض بنا لیا تھا کہ وہ مجھے پریشان نہیں کریں گے۔

اپنے ابتدائی برسوں میں میں اپنی نانی ہی کو اپنی ماں سمجھتا تھا۔ یہ وہ برس ہوتے ہیں جب کوئی پروان چڑھتا ہے۔ میری ماں اس کے بعد آئی تھی' میں پہلے ہی پروان چڑھ چکا تھا' پہلے ہی سے ایک خاص سانچے میں ڈھل چکا تھا۔ اور میری نانی نے میری بے انتہا مدد کی تھی۔ میرا نانا مجھ سے محبت کرتا تھا لیکن اس نے میری زیادہ مدد نہیں کی تھی۔ وہ بہت محبت کرنے والا تھا لیکن مددگار بننے کے لیے سہارا بننے کے لیے کچھ زیادہ کی ضرورت ہوتی ہے ...... ایک خاص نوع کی مضبوطی کی۔ وہ میری نانی سے خوفزدہ بھی تھا۔ ایک اعتبار سے وہ ایک زن مرید شوہر تھا۔ لیکن وہ مجھ سے محبت کرتا تھا' وہ میری مدد کرتا تھا ...... اگر وہ زن مرید شوہر تھا تو میں کیا کر سکتا ہوں؟ ننانوے اعشاریہ نو فیصد شوہر زن مرید ہی ہوتے ہیں' سو یہ ٹھیک ہے۔

میں اس بوڑھے آدمی' اپنے نانا کی اُس پریشانی کو سمجھ سکتا ہوں جو میری غلطی سے پیدا ہوئی تھی۔ سارا دن وہ اپنی گدی میں بیٹھا ہوتا' جیسا کہ امیر آدمی کی نشست کو ہندوستان میں کہتے ہیں' اپنے گاہکوں کی کم اور شکوہ شکایت کرنے والوں کی زیادہ سنتا! لیکن وہ انہیں کہا کرتا تھا: "میں اس کے کیے ہوئے ہر نقصان کا ہرجانہ بھرنے کو تیار ہوں لیکن یاد رکھو میں اسے سزا نہیں دوں گا۔"

اس کا تحمل بہت زیادہ تھا میرے ساتھ' ایک شرارتی بچے کے ساتھ ...... حتیٰ کہ میں بھی اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اس بچے جیسا کوئی بچہ کئی برسوں کے لیے مجھے دیا گیا ہوتا ...... تو رام بھلی! حتیٰ کہ چند منٹ کے لیے ہی سہی' میں تو ایسے بچے کو ہمیشہ کے لیے دروازے سے باہر دھکیل دیتا۔ شاید ان برسوں نے میرے نانا کے لیے معجزے کا کام انجام دیا ہو' جس کا صلہ وہ تحمل تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ خاموش ہوتا گیا۔ میں نے ہر روز خاموشی کو بڑھتے ہوئے دیکھا۔ کبھی کبھی میں کہا کرتا: "نانا! آپ مجھے سزا دے سکتے ہیں۔ آپ کو اتنا برداشت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اور کیا تم اس پر یقین کر سکتے ہو' وہ چیخ اٹھتا تھا! اُس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے اور وہ کہتا: "تمہیں سزا دوں؟ میں تو ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اپنے آپ کو تو سزا دے سکتا ہوں لیکن تمہیں' نہیں۔"

میں نے کبھی اپنے لیے اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے بھی غصے کا سایہ نہیں دیکھا ...... اور یقین کرو کہ میں نے ہر وہ حرکت کی جو ہزار بچے ہی کر سکتے تھے۔ صبح کے وقت' ناشتے سے بھی پہلے سے لے کر رات گئے تک میں شرارتیں کرتا رہتا تھا۔ بعض اوقات میں دیر گئے گھر آتا تھا ...... صبح کے تین بجے ...... لیکن کیا آدمی تھا وہ! اس نے کبھی نہیں کہا: "تم بہت دیر سے آئے ہو۔ کسی بچے کے گھر آنے کا یہ وقت تو نہیں ہوتا۔" ناں' ایک مرتبہ بھی نہیں' درحقیقت میرے سامنے تو وہ دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کرتا تھا۔

آبائی قصبے میں واپسی:

نانا کی وفات کے بعد وہ نانی سمیت اپنے آبائی قصبے گاڈروارا چلا آیا۔ جہاں تک نانی کا تعلق ہے تو اُس نے 1970ء میں اپنی وفات سے قبل خود کو اوشو کی شاگرد بنا لیا تھا۔ وہ اپنی زندگی کی آخری سانس تک لاڈلے نواسے کی ہمدرد اور دوست رہی۔ نانا اور نانی کی وفات کو رجنیش نے تو بہت محسوس کیا لیکن اس کے والد نے شاید سکھ کا سانس لیا ہو کیونکہ بقول اوشو:

وہ سات برس ...... وہ مجھے بار بار یاد دلاتا تھا' "وہ ہماری بنیادی غلطی تھی۔ وہی وقت تھا کہ ہم تمہیں کچھ قابلِ قدر بنانے کا انتظام کر سکتے تھے لیکن تمہارے نانا اور نانی' ان دو

بوڑھوں نے تمہیں مکمل طور پر برباد کر دیا ہے۔"

اپنے قصبے میں آ کر بھی اوشو کے چلن وہی رہے جو ننھیال میں تھے' باپ کو ہمیشہ اس سے شکایت ہی رہی' اوشو کی بھی اپنے اہل خانہ سے کبھی نہ بن پائی۔ وہ کہتا ہے کہ میرے باپ کا مجھ پر صرف ایک ہی احسان ہے' اُس نے صرف ایک ہی چیز مجھے سکھائی اور وہ تھی مقامی دریا سے محبت اور اس کے فرحت بخش پانیوں میں تیراکی۔ اس دریا کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:

پہلی چیز جو میرے باپ نے مجھے سکھائی تھی _اور یہ واحد چیز تھی جو اس نے مجھے سکھائی__ وہ تھی اس چھوٹے سے دریا سے محبت جو ہماری بستی کے قریب سے بہتا تھا__ اس نے صرف مجھے یہ سکھایا__ دریا میں تیرنا__ یہی تھا وہ سب جو اس نے مجھے سکھایا تھا لیکن میں اس کا از حد ممنون ہوں' اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ میری زندگی میں بہت سی تبدیلیاں لایا۔ بالکل سدھارتھ کے مانند' میں دریا سے محبت کرنے لگا۔

یہ میرا روزانہ کا معمول بن گیا کہ میں دریا کے ساتھ کم از کم پانچ سے آٹھ گھنٹے گزارا کرتا تھا۔ صبح کے تین بجے سے میں دریا کے ساتھ ہوتا' آسمان ستاروں سے بھرا ہوتا تھا اور ستارے پانی میں منعکس ہو رہے ہوتے تھے اور وہ ایک خوبصورت دریا تھا' اس کا پانی اس قدر شیریں تھا کہ لوگوں نے اسے شکر کا نام دے دیا تھا__ شکر کا مطلب ہوتا ہے "چینی" یہ ایک خوبصورت مظہر ہے۔

میں نے اسے رات کی تاریکی میں ستاروں کے ہمراہ دیکھا ہے' سمندر کی طرف رقص کرتے ہوئے محو سفر__ میں نے اسے طلوع ہوتے ہوئے سورج کے ہمراہ دیکھا ہے' میں نے چودھویں کے چاند کے ہمراہ دیکھا ہے۔ میں نے اسے غروب آفتاب کے ہمراہ دیکھا ہے۔ میں نے اس کے کنارے پر تنہا یا دوستوں کے ہمراہ بنسی بجاتے ہوئے اسے بیٹھے ہوئے دیکھا ہے' اس کے کنارے پر رقص کرتے ہوئے' مراقبہ کرتے ہوئے' اس میں کشتی چلاتے ہوئے یا اس کے پار تیرتے ہوتے اسے دیکھا ہے۔ برسات میں' سردیوں میں' گرمیوں میں اور میں اپنے باپ کا از حد ممنون ہوں۔ جو واحد تعلیم اس نے مجھے دی وہ تھا دریا سے راز و نیاز۔ اسے خود بھی دریا سے گہری محبت تھی۔ جب کبھی تم بہتی ہوئی' متحرک چیزوں سے محبت کرتے ہو تو تم زندگی کی مختلف بصیرت کے حامل ہوتے ہو۔

دریا کی لہروں کو دیکھتے دیکھتے اس کے باطن میں بھی بہت سے طوفان سر اٹھانے لگے' من کے ساگر میں اٹھنے والی بلند و بالا لہروں نے بہت کچھ درہم برہم کر کے رکھ دیا اور ساتھ ہی ایک نئے جہان کی بنیادیں بھی استوار کر دیں۔ اب اوشو کو اسی نئے جہان میں رہنا تھا۔

روحانی استغراق کا آغاز:

محض چودہ سال کی عمر میں اُسے پہلی بار سچائیوں کے خزانے کی ایک جھلک دکھائی دی۔ یہ وہی دن تھے جب وہ موت کے انتظار کے سات روزہ تجربے سے گزر رہا تھا۔ اس تجربے کا قصہ بھی خود اُسی کی زبانی سنیے:

میرا نانا مجھے بتایا کرتا تھا کہ جب میں پیدا ہوا تھا تو اس نے اس زمانے کے مشہور ترین نجومیوں میں سے ایک سے زائچہ بنوایا تھا۔ نجومی نے میرا زائچہ بنانا تھا لیکن اس نے اسے پڑھا اور بولا: "اگر یہ بچہ سات برس کی عمر سے زیادہ زندہ رہا تو پھر میں اس کا زائچہ بناؤں گا۔ یہ ناممکن لگتا ہے کہ یہ سات برس کی عمر سے زیادہ جی سکتا ہو' سو اگر بچہ مر جائے گا تو زائچہ بنانے کا کیا فائدہ' یہ تو بیکار رہے گا۔ اور یہ میری عادت رہی ہے کہ جب تک مجھے یقین نہ ہو کہ زائچہ فائدہ مند ہو گا میں اسے کبھی نہیں بناتا ہوں۔"

وہ اس سے پہلے ہی مر گیا سو اس کے بیٹے نے زائچہ تیار کیا۔ لیکن وہ بھی الجھ کر رہ گیا' کہنے لگا۔ "یہ قریباً یقینی امر ہے کہ یہ بچہ اکیس برس کی عمر میں مر جائے گا۔ ہر ساتویں سال اسے موت کا سامنا کرنا پڑے گا۔" سو میرے والدین' میرا خاندان میری موت کے حوالے سے ہمیشہ فکر مند رہتا تھا۔ جب بھی میں سات سالہ دائرے کے اختتام پر پہنچتا وہ خوف زدہ ہو جاتے اور وہ درست تھے۔ سات برس کی عمر میں تو میں زندہ بچ رہا لیکن مجھے موت کا ایک گہرا تجربہ ہوا__ میری اپنی موت کا نہیں بلکہ میرے نانا کی موت کا۔ اور میری اس کے ساتھ اس حد تک جڑت (Attachment) تھی کہ اس کی موت میری موت سی لگی۔

اپنے بچگانہ انداز میں میں نے اس کی موت کی نقل کی۔ میں نے تین دنوں تک نہ کچھ کھایا اور نہ کچھ پیا' اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اگر میں نے ایسا کیا تو یہ بے وفائی ہو گی۔ وہ میرا جزو تھا' میرا حصہ تھا۔ میں اس کی موجودگی میں' اس کی محبت میں پروان چڑھا تھا۔

جب وہ مرا ہے تو میں نے محسوس کیا کہ کھانا کھانا بے وفائی ہو گی۔ میں زندہ رہنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ بات بچگانہ تھی لیکن اس کے وسیلے کوئی بہت گہری شے رونما ہوئی۔ تین دنوں تک میں پڑا رہا' میں بستر سے ہی نہیں نکلا۔ میں نے کہا "اب وہ مر گیا ہے تو میں زندہ نہیں رہنا چاہتا ہوں۔" میں زندہ تو رہا لیکن وہ تین دن موت کا تجربہ بن گئے۔ ایک اعتبار سے میں مر گیا تھا اور مجھے ادراک ہوا__ اب میں تمہیں اس کے بارے میں بتانے پر قادر ہوں' اگرچہ اس وقت وہ محض ایک بے کار سا تجربہ ہی تھا__ مجھے محسوس ہوا کہ موت ناممکن ہے۔ یہ ایک

احساس تھا۔ جب میں چودہ برس کی عمر کو پہنچا تو میرا خاندان دوبارہ فکرمند ہوا کہ میں مر جاؤں گا۔ میں زندہ تو رہا لیکن میں نے پھر اس کی شعوری طور پر کوشش کی۔ میں نے انہیں کہا: ''اگر موت اسی طرح واقع ہو گی جس طرح نجومی نے کہا ہوا ہے تو پھر بہتر یہی ہے کہ تیاری کر لی جائے — اور موت کو موقع کیوں دیا جائے؟ کیوں نہ میں آگے بڑھوں اور آدھے راستے ہی میں اسے جا لوں؟ اگر مجھے مرنا ہے تو پھر بہتر یہی ہے کہ شعوری طور پر مرا جائے۔''

سو میں نے سکول سے سات دنوں کی رخصت لے لی۔ میں اپنے پرنسپل سے ملا اور اسے بتایا: ''میں مرنے جا رہا ہوں۔''

وہ بولا: ''کیا بکواس کر رہے ہو تم! کیا تم خودکشی کر رہے ہو؟ مرنے جا رہا ہوں سے تمہارا کیا کہنا مقصود ہے؟''

میں نے اسے نجومی کی پیش گوئی کے بارے میں آگاہ کیا کہ ہر سات برس کے بعد موت کے امکان سے میرا سامنا ہو گا۔ میں نے اسے بتایا: ''میں موت کا انتظار کرنے لیے سات روز پڑا رہوں گا۔ اگر موت آتی ہے تو بہتر ہے اس کو شعوری طور پر ملا جائے تاکہ یہ ایک واردات (Experience) بن جائے۔''

میں اپنی بستی کے باہر ہی واقع مندر گیا۔ میں نے پروہت سے طے کیا کہ وہ مجھے پریشان نہیں کرے گا۔ وہ ایک بہت تنہا مندر تھا جہاں کوئی نہیں آیا کرتا تھا — کھنڈروں میں واقع پرانا مندر تھا۔ اس طرف کوئی کبھی نہیں آیا تھا۔ سو میں نے اسے بتایا: ''میں مندر میں رہوں گا۔ تم بس دن میں ایک مرتبہ کھانے اور پینے کے لیے مجھے دے دیا کرنا اور سارا دن میں یہاں لیٹا موت کا انتظار کروں گا۔''

میں نے سات دنوں تک انتظار کیا۔ وہ سات دن ایک خوبصورت تجربہ بن گئے۔ موت آئی ہی نہیں لیکن اپنی طرف سے میں نے مرجانے کی ہر طرح سے کوشش کی۔

انوکھے احساسات رونما ہونے۔ بہت سی باتیں رونما ہوئیں لیکن بنیادی ثمر یہ تھا — کہ اگر تم محسوس کر رہے ہو کہ تم مرنے والے ہو تو تم پرسکون اور خاموش ہو جاتے ہو۔ تب کوئی شے فکرمندی پیدا نہیں کرتی ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ تمام تفکرات زندگی سے ربط رکھتے ہیں۔ زندگی تمام تفکرات کی جڑ بنیاد ہے۔ جب کسی روز تم مر جاؤ گے تو فکر کیسی؟

میں وہاں لیٹا ہوا تھا۔ تیسرے یا چوتھے دن ایک سانپ مندر میں داخل ہوا۔ وہ میری نظر میں تھا' میں سانپ کو دیکھ رہا تھا لیکن خوفزدہ بالکل نہیں تھا۔ دفعتاً مجھے بہت انوکھا احساس ہوا۔ سانپ نزدیک سے نزدیک تر آ رہا تھا اور مجھے انوکھا احساس ہو رہا تھا۔ ادھر خوف بالکل نہیں تھا سو میں نے سوچا: ''جب موت آ رہی ہے تو ہو سکتا ہے وہ اس سانپ کے

ذریعے آ رہی ہو' سو خوف کیوں؟ انتظار کرو!''

سانپ میرے اوپر سے گزر کے پرے نکل گیا۔ خوف غائب ہو چکا تھا۔

اگر تم موت کو قبول کر لیتے ہو تو خوف بالکل نہیں رہتا ہے۔ اگر تم زندگی سے چمٹتے ہو تو پھر ہر خوف آ گھیرتا ہے۔

کئی مرتبہ مکھیاں میرے اردگرد بھنبھنانے لگیں۔ وہ اردگرد اڑتی رہتیں' مجھ پر سرسراتی پھرتیں اور میرے چہرے پر پھرتی رہتیں۔ بعض اوقات مجھے غصہ آ جاتا تھا اور جی چاہتا تھا انہیں پرے جھٹک دوں لیکن تب میں سوچتا تھا: ''اس کا کیا فائدہ؟ جلد یا بدیر میں نے مر جانا ہے اور تب جسم کی دیکھ بھال کرنے کو کوئی نہیں ہو گا۔ سو یہ جو کرتی ہیں کرنے دو۔''

جس لمحے میں نے فیصلہ کیا کہ یہ جو کرتی ہیں کرتی رہیں اسی لمحے غصہ غائب ہو گیا۔ وہ ہنوز جسم پر موجود ہوتی تھیں لیکن یوں تھا کہ گویا میرا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ وہ یوں رینگتی تھیں گویا کسی دوسرے کے جسم پر رینگتی ہوں۔ فوری طور پر ایک فاصلہ پیدا ہو گیا تھا۔

اگر تم موت کو قبول کر لیتے ہو تو ایک فاصلہ' ایک بُعد پیدا ہو جاتا ہے۔ زندگی اپنی تمام تر پریشانیوں' اشتعال انگیزیوں اور ہر شے سمیت دور چلی جاتی ہے۔

ایک اعتبار سے میں مر گیا تھا لیکن مجھے ادراک ہوا کہ کوئی لافانی شے وہاں ہے۔ جب ایک دفعہ تم موت کو کاملاً قبول کر لیتے ہو تو تم اس سے آگاہ ہو جاتے ہو۔

پھر اکیس برس کی عمر میں دوبارہ میرا خاندان انتظار کر رہا تھا۔ سو میں نے ان سے پوچھا: ''آپ کیوں انتظار کر رہے ہیں؟ انتظار مت کریں۔ اب میں نہیں مروں گا۔''

یہ ٹھیک ہے کہ جسمانی طور پر ایک دن میں مر جاؤں گا۔ تاہم نجومی کی اس پیش گوئی نے میری بہت امداد کی کیونکہ اس نے مجھے بہت ابتدا میں ہی موت سے آگاہ کروا دیا تھا۔ میں مراقبہ کر سکتا تھا اور قبول کر سکتا تھا کہ وہ آ رہی ہے۔

اب غوروفکر میں ڈوبے رہنا اور گردوپیش سے بے نیاز ہو جانا اُس کا معمول بن گیا مگر یہ محض آغاز تھا کیونکہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا' رجنیش کے مراقبوں کا عمل طویل سے طویل اور گہرے سے گہرا ہوتا چلا گیا۔ عقیدت مندوں کا کہنا ہے کہ روحانی جستجو کے تحت جاری تیز رفتار سفر نے اوشو کی جسمانی صحت کو بہت نقصان پہنچایا' یہاں تک کہ جاننے والے اور والدین یہ سوچنے لگے تھے کہ شاید ہی یہ زیادہ دنوں تک جی پائے گا...... لیکن وہ اس کیفیت سے زندہ سلامت بچ نکلا۔

ابتدائی تعلیم اور یونیورسٹی کا زمانہ:

اوشو سکول کی شکل تک دیکھنے کو تیار نہیں تھا تاہم گھر والوں کے شدید اصرار کے باعث وہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ لیکن طالب علمانہ زندگی کے پہلے ہی دن ایک استاد سے ایسا الجھا کہ اس کی نوکری ختم کروا دی۔ یہ قصہ اور چند دیگر واقعات خود اُسی کی زبانی سنیے:

''نہیں۔'' یہ پرائمری سکول میں داخل ہونے سے پہلے میرا اولین لفظ تھا۔ میں نے اپنے باپ سے کہا: ''نہیں، میں اس پھاٹک سے اندر داخل نہیں ہونا چاہتا ہوں۔ یہ سکول نہیں ہے، قید خانہ ہے۔'' ٹھیک وہ پھاٹک اور عمارت کا رنگ ..... یہ بہت عجیب ہے، خصوصاً ہندوستان میں، جیلوں اور سکولوں کو ایک ہی رنگ کیا جاتا ہے اور دونوں کو سرخ اینٹ سے بنایا جاتا ہے۔ یہ جاننا دشوار ہوتا ہے کہ عمارت ایک زندان ہے یا سکول۔ شاید کبھی کسی عملی مسخرے نے کرتب دکھایا ہو گا مگر کرتب اس نے خوب دکھایا ہے۔''

میں نے کہا: ''ذرا دیکھو تو اس سکول کو ___ تم اسے سکول کہتے ہو؟ اس پھاٹک کو تو دیکھو! اور تم مجھے مجبور کر رہے ہو کہ میں چار برس کے لیے اس میں داخلہ لے لوں۔''

میرا باپ کہنے لگا: ''مجھے ہمیشہ ڈر رہتا تھا ___'' اور ہم پھاٹک پر ہی کھڑے ہوئے تھے، بالکل باہر ہی، کیونکہ میں نے ابھی تک اسے اجازت نہیں دی تھی کہ وہ مجھے اندر لے جائے۔ وہ بولتا رہا..... ''مجھے ہمیشہ تمہارے نانا سے ڈر رہتا تھا اور خصوصاً اس عورت سے، تمہاری نانی سے، کہ وہ تمہیں برباد کر دیں گے۔''

میں نے کہا: ''تمہارا خوف درست تھا لیکن جو ہونا تھا سو ہو چکا اور کوئی شخص بھی اب اسے لوٹا نہیں سکتا ہے سو مہربانی کرو آؤ گھر چلتے ہیں۔''

وہ بولا: ''کیا! تمہیں تعلیم حاصل کرنا ہو گی۔''

میں نے کہا: ''یہ کس قسم کی شروعات ہے؟ مجھے ہاں یا نہیں کہنے کی بھی آزادی نہیں ہے۔ آپ اسے تعلیم کہتے ہیں؟ لیکن اگر آپ ایسا چاہتے ہیں تو مہربانی کیجئے، مجھ سے پوچھئے مت، یہ ہے میرا ہاتھ، مجھے اندر گھسیٹ لے چلئے۔ کم از کم مجھے یہ اطمینان تو رہے گا کہ میں اس گندے ادارے میں خود سے داخل نہیں ہوا تھا۔ براہِ کرم مجھ پہ اتنی سی مہربانی تو کیجئے۔''

میرا باپ خاصا پریشان ہو گیا تھا سو وہ مجھے گھسیٹ کر اندر لے گیا۔ اگرچہ وہ بہت سادہ آدمی تھا تاہم وہ جلد ہی سمجھ گیا کہ یہ درست نہیں تھا۔ اس نے مجھے کہا: ''اگرچہ میں تمہارا باپ ہوں تاہم تمہیں گھسیٹنے کو میں درست محسوس نہیں کرتا۔''

میں نے کہا: ''مجھے غلط نہیں لگتا ہے۔ آپ جو کچھ بھی کر چکے ہیں، بالکل درست ہے،

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص مجھے گھسیٹتا نہیں میں اپنے فیصلے سے تو نہیں جاؤں گا۔ میرا فیصلہ تو ہے ''نہیں''۔ آپ مجھ پر اپنا فیصلہ تھوپ سکتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ میں روٹی، کپڑے، مکان اور ہر شے کے لئے آپ کا دست نگر (Dependent) ہوں۔ فطری طور پر آپ کی حیثیت استحقاقی ہے۔''

سکول میں داخلہ ایک نئی زندگی کی شروعات تھی۔ برسوں میں محض ایک جانور کے مانند جیا تھا۔ میں ایک جنگلی انسان نہیں کہہ سکتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ ادھر کوئی جنگلی انسان نہیں ہوتے۔

صرف کبھی کبھار کوئی انسان جنگلی انسان بن جاتا ہے۔ میں اب ہوں، بدھ تھا، زرتشت تھا ___ لیکن اس وقت یہ کہنا بالکل سچ تھا کہ برسوں تک میں کسی جنگلی جانور کے مانند جی چکا ہوں۔ میں کبھی رضامندی سے سکول نہیں گیا۔ اور میں خوش ہوں کہ مجھے اندر گھسیٹا گیا، میں خوش ہوں کہ میں کبھی خود سے رضامندی سے نہیں گیا۔ سکول حقیقتاً گندا تھا ___ سب سکول گندے ہوتے ہیں۔ درحقیقت ایک ایسا ادارہ تخلیق کرنا ہے جہاں بچے سیکھیں لیکن یہ درست نہیں کہ انہیں تعلیم دی جائے۔ تعلیم گندی ہوا کرتی ہے۔

اور سکول میں میں نے پہلی شے کیا دیکھی؟ وہ پہلی شے میرا اپنی جماعت اول کے استاد سے ٹکراؤ تھا۔ میں نے خوبصورت اور گندے لوگ دیکھے ہیں لیکن میں نے اس جیسی چیز دوبارہ کبھی نہیں دیکھی! وہ استاد تھا اور اس نے مجھے پڑھانا تھا۔ میں تو اس آدمی کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ بھگوان نے لازماً اس کا چہرہ بے انتہا جلدی میں بنایا ہو گا۔ ہو سکتا ہے اس کا مثانہ لبریز ہو چکا ہو اور محض کام نمٹانے کے لیے اس نے اس آدمی کو بنایا ہو اور باتھ روم کو بھاگ پڑا ہو۔ کیسا آدمی اس نے بنایا تھا! اس کی صرف ایک آنکھ اور مڑی ہوئی ناک تھی۔ وہ ایک آنکھ تو ٹھیک تھی لیکن مڑی ہوئی ناک نے حقیقتاً اس کے چہرے کی بدصورتی میں اضافہ کر دیا تھا۔ اور وہ جسیم تھا! ضرور اس کا وزن چار سو پاؤنڈ رہا ہو گا، اس سے کم نہیں۔

وہ میرا پہلا ماسٹر تھا ___ میرا مطلب ہے استاد۔ چونکہ ہندوستان میں سکول ٹیچروں کو ''ماسٹر'' پکارا جاتا ہے۔ اگر آج بھی میں اس شخص کو دیکھوں تو یقینی طور پر لرزنا شروع کر دوں گا۔ بہرحال وہ کوئی انسان نہیں تھا، وہ تو کوئی گھوڑا تھا!

وہ پہلا استاد ___ مجھے اس کے حقیقی نام کا علم نہیں ہے اور نہ ہی سکول میں کوئی دوسرا شخص اس کے نام سے واقف تھا، خصوصاً بچے، وہ تو بس اسے کنٹر ماسٹر کہا کرتے تھے۔ کنٹر کا مطلب ہوتا ہے ''کانا''۔ بچوں کے لیے یہی کافی تھا اور یہ اس شخص کی تحقیر بھی تھی۔ ہندی میں کنٹر کا مطلب نہ صرف ''کانا'' ہوتا ہے بلکہ یہ ایک گالی بھی ہے۔ اس کو ایسے ترجمہ نہیں کیا

جاسکتا ہے کیونکہ ترجمے میں اس کا زور کھو جائے گا۔ سو ہم سب اس کی موجودگی میں اسے کنٹر ماسٹر کہا کرتے تھے اور جب وہ نہیں ہوتا تھا تو ہم اسے صرف کنٹر — کانا کہا کرتے تھے۔

وہ نہ صرف بدصورت تھا بلکہ جو کچھ بھی کرتا تھا بدنما ہوتا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ عین میرے پہلے دن کچھ ضرور واقع ہونا تھا۔ وہ بچوں کو بے رحمی کے ساتھ سزا دیا کرتا تھا۔ میں نے کبھی کسی ایسے استاد کے بارے میں سُنا یا دیکھا نہیں کہ جو بچوں کے ساتھ ایسا کچھ کرتا ہو۔

وہ حساب پڑھایا کرتا تھا۔ میں تھوڑا تھوڑا حساب جانتا تھا کیونکہ میری نانی مجھے گھر پر ہی پڑھایا کرتی تھی۔ خصوصاً تھوڑی سی زبان اور کچھ حساب۔ سو میں کھڑکی سے باہر پیپل کے خوبصورت درخت کو دیکھ رہا تھا جو دھوپ میں چمک رہا تھا۔ ادھر کوئی ایسا دوسرا درخت نہیں ہے جو دھوپ میں اتنی خوبصورتی سے چمکتا ہو کیونکہ اس کا ہر ہر پتا الگ الگ رقص کرتا ہے اور پورا درخت قریب قریب ایک کورس (Chorus) بن جاتا ہے — ہزاروں چمکتے ہوئے رقاص اور گلوکار اکٹھے لیکن آزاد بھی۔ میں نے درخت کو دیکھا' اس کے پتے ہلکی ہلکی ہوا میں رقص کر رہے تھے اور دھوپ ہر ہر پتے پر چمک رہی تھی اور ہزاروں طوطے بلا وجہ لطف اندوز ہوتے ہوئے ایک سے دوسری شاخ پر پھدک رہے تھے۔ آہ! انہیں سکول نہیں جانا پڑتا تھا۔

میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا اور کنٹر ماسٹر چھلانگ لگا کر میرے قریب آ دھمکا۔

وہ بولا: ''معاملات کی ابتدا ہی سے ٹھیک کر دینا درست ہوتا ہے۔''

میں نے کہا: ''میں اس بات سے مکمل طور پر اتفاق کرتا ہوں۔ میں بھی ہر شے کو وہیں رکھنا چاہتا ہوں جہاں اسے بہت ابتداء ہی سے ہونا چاہیے تھا۔''

وہ بولا: ''جب میں حساب پڑھا رہا تھا تو تم کھڑکی سے باہر کیوں دیکھ رہے تھے؟''

''حساب کو سننا پڑتا ہے' دیکھنا نہیں۔ مجھے تمہارے خوبصورت چہرے کو نہیں دیکھنا ہے' میں اسی سے گریز کے لیے کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ جہاں تک حساب کا تعلق ہے تو تم مجھ سے پوچھ سکتے ہو' میں نے اسے سنا ہے اور میں اسے جانتا ہوں۔''

اس نے مجھ سے پوچھا اور وہ ایک بہت طویل دشواری کا آغاز تھا — میرے لیے نہیں بلکہ اس کے لیے۔ دشواری یہ تھی کہ میں نے درست جواب دیا۔ وہ اس پر یقین نہیں کر سکتا تھا' کہنے لگا: ''چاہے تم درست ہو یا غلط میں تمہیں سزا دوں گا' اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ درست نہیں کہ جب استاد پڑھا رہا ہو تو کھڑکی سے باہر دیکھا جائے۔''

اس نے مجھے اپنے سامنے بلا لیا۔ اپنے ڈیسک سے اس نے پنسلوں کا ڈبا نکالا۔ میں نے ان مشہور پنسلوں کا سن رکھا تھا۔ وہ ان پنسلوں میں سے ایک کو تمہاری ہر انگلی کے درمیان میں رکھ دیا کرتا تھا اور پھر تمہارے ہاتھ کو سختی سے دباتا تھا اور ''کیا تم کچھ مزید چاہتے

ہو؟'' چھوٹے بچوں سے وہ یہ پوچھتا رہتا!

میں نے پنسلوں کو دیکھا اور کہا: ''میں نے ان پنسلوں کا سنا ہے لیکن اس سے پہلے کہ تم انہیں میری انگلیوں کے درمیان رکھو' یاد رکھو ایسا کرنا تمہیں بہت مہنگا پڑے گا' شاید تمہاری ملازمت ہی چلی جائے۔''

وہ ہنسنے لگا۔ میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی ڈراؤنے خواب کا عفریت ہے جو تم پر ہنس رہا ہے۔ وہ بولا: ''کون مجھ سے بچ سکتا ہے؟''

میں نے کہا: ''بات یہ نہیں ہے میں پوچھنا چاہتا ہوں' جب حساب پڑھایا جا رہا ہو تو کھڑکی سے باہر دیکھنا غیر قانونی ہے کیا؟ اور اگر جو کچھ پڑھایا جا رہا ہے میں اس سے متعلق سوالات کا جواب دینے کا اہل ہوں اور میں اسے لفظ بہ لفظ دہرانے کو تیار ہوں تو پھر کیا کھڑکی سے باہر دیکھنا کسی طور غلط ہے؟ تو پھر اس کلاس روم میں کھڑکی کیوں لگائی گئی ہے؟ کیا مقصد ہے اس کا؟ چونکہ کوئی شخص سارا دن کچھ پڑھاتا ہے اور رات میں کھڑکی کی ضرورت ہی نہیں ہوتی جب کوئی اس میں سے باہر دیکھنے والا ہی نہیں ہوتا۔''

وہ بولا: ''تم تو بڑے فتنہ پرور ہو۔''

میں نے کہا: ''یہ بالکل سچ ہے اور میں ہیڈ ماسٹر کے پاس یہ پوچھنے جا رہا ہوں کہ کیا تمہارا مجھے سزا دینا جائز ہے جبکہ میں تمہیں درست جواب دے چکا ہوں۔''

وہ تھوڑا سا نرم پڑ گیا۔ میں حیران ہوا کیونکہ میں نے سن رکھا تھا کہ وہ ایسا انسان ہی نہیں تھا جس کو کسی طور دھیما کیا جا سکتا ہو۔

تب میں نے کہا: ''اور پھر میں میونسپل کمیٹی کے صدر کے پاس جاؤں گا' جو کہ اس سکول کو چلاتی ہے۔ کل میں ایک پولیس کمشنر کے ساتھ آؤں گا تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے کہ یہاں کس طرح کی حرکتیں کی جا رہی ہیں؟

وہ مرتعش ہو گیا۔ دوسروں کو ایسا دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن میں ایسی چیزیں دیکھ سکتا ہوں جو دوسرے لوگ نہیں دیکھ پاتے۔ سو ہو سکتا ہے مجھے دیواریں نظر نہ آئیں لیکن میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کو نظر انداز نہیں کرتا ہوں' حتیٰ کہ خوردبینی اشیاء کو بھی۔ میں نے اسے کہا: ''تم لرز رہے ہو' اگرچہ تم اسے تسلیم نہیں کرو گے۔ لیکن ہم دیکھیں گے۔ پہلے مجھے ذرا ہیڈ ماسٹر کے پاس جانے دو۔''

میں گیا اور ہیڈ ماسٹر کہنے لگا: ''میں جانتا ہوں یہ شخص بچوں پر تشدد کرتا ہے۔ یہ غیر قانونی عمل ہے۔ لیکن میں اس بارے میں کچھ نہیں کر سکتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قصبے میں سب سے پرانا سکول ٹیچر ہے اور قریباً ہر شخص کا باپ اور دادا کم از کم ایک مرتبہ اس کے

شاگرد رہ چکے ہیں۔ سو اس کے خلاف کوئی انگلی بھی نہیں اٹھا سکتا۔"

میں نے کہا: "مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔ میرا باپ اس کا شاگرد رہا ہے اور میرا دادا بھی۔ مجھے اپنے باپ دادا کی پروا نہیں ہے' درحقیقت میں تو اس خاندان سے حقیقتاً تعلق ہی نہیں رکھتا ہوں۔ میں تو ان سے دور رہا ہوں۔ میں تو یہاں پردیسی ہوں۔"

ہیڈ ماسٹر نے کہا: "میں فوری طور پر پہچان سکتا ہوں کہ تم ضرور پردیسی ہو گے لیکن' میرے بیٹے' غیر ضروری مسائل میں مت الجھو۔ وہ تم پر تشدد کرے گا۔"

میں نے کہا: "ایسا کرنا آسان نہیں ہے۔ اس سب تشدد کے خلاف یہ میری جدوجہد کا آغاز ہے۔ میں لڑوں گا۔"

اور میں نے اس کی میز پر گھونسا مارا ___ یہ ٹھیک ہے کہ وہ محض ایک چھوٹے بچے کا گھونسا تھا اور بولا: "مجھے تعلیم یا کسی شے کی فکر نہیں ہے لیکن مجھے اپنی آزادی کی ضرور فکر ہے۔ کوئی شخص بھی مجھے بلاوجہ ہراساں نہیں کر سکتا ہے۔ تمہیں مجھے تعلیمی ضابطہ دکھانا ہو گا۔ میں پڑھ نہیں سکتا ہوں اور تمہیں مجھے دکھانا ہو گا کہ کھڑکی سے باہر دیکھنا غیر قانونی ہے جبکہ میں تمام سوالات کا درست جواب دے سکتا ہوں۔"

اس نے کہا: "اگر تم نے درست جواب دئے ہیں تو پھر یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے کہ تم کدھر دیکھ رہے تھے۔"

میں نے کہا: "آئیے میرے ساتھ۔"

وہ اپنے تعلیمی ضابطے' قدیم کتاب جو وہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتا تھا' کے ساتھ میرے ہمراہ آیا۔ میرا خیال ہے کہ کسی شخص نے اس قدیم کتاب کو پہلے کبھی نہیں پڑھا ہو گا ___ ہیڈ ماسٹر نے کنٹر ماسٹر سے کہا: "بہتر یہی ہے کہ اس بچے کو ہراساں مت کرو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ممکن ہے وہ تم پر الٹ پڑے۔ وہ آسانی سے نہیں چھوڑے گا۔"

لیکن کنٹر ماسٹر اس قسم کا بندہ ہی نہیں تھا۔ خوف زدہ ہو کر وہ زیادہ جارح اور متشدد ہو گیا۔ وہ بولا: "میں اس بچے کو دیکھ لوں گا ___ آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اس تعلیمی ضابطے کی کون پروا کرتا ہے؟ میں ساری زندگی یہاں استاد رہا ہوں اور کیا یہ بچہ مجھے ضابطہ پڑھائے گا؟"

میں نے کہا: "کل اس عمارت میں یا تو تم ہو گے یا میں؛ لیکن ہم ایک ساتھ یہاں نہیں رہ سکتے ہیں۔ بس کل تک انتظار کر لو۔"

میں گھر آیا اور اپنے باپ کو سب کچھ بتایا۔ وہ بولا: "میں فکر مند تھا کہ کیا میں نے تمہیں دوسروں کے لیے اور خود تمہارے اپنے لیے دشواریاں کھڑی کرنے اور خود کو بھی ان

میں گھسیٹنے کے لیے سکول میں داخل کرایا ہے۔"

میں نے کہا: "نہیں' میں تو بس آپ کو اطلاع دے رہا ہوں تاکہ بعد میں آپ یہ نہ کہیں کہ آپ کو اندھیرے میں رکھا گیا تھا۔"

میں پولیس کمشنر کے پاس چلا گیا۔ وہ ایک پیارا انسان تھا' مجھے توقع نہیں تھی کہ کوئی پولیس والا اتنا اچھا ہو سکتا ہے۔ وہ کہنے لگا: "میں نے اس آدمی کے متعلق سن رکھا ہے۔ درحقیقت وہ خود میرے بیٹے پر تشدد کرتا رہا ہے۔ لیکن کسی نے شکایت ہی نہیں کی۔ تشدد کرنا غیر قانونی ہے لیکن جب تک تم شکایت نہیں کرتے کچھ نہیں کیا جا سکتا اور میں خود شکایت نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے فکر ہے کہ کہیں وہ میرے بیٹے کو فیل نہ کر دے۔ سو بہتر یہی ہے کہ اس کو تشدد کرتے رہنے دیا جائے۔ یہ صرف چند مہینوں کا مسئلہ ہے' پھر میرا بچہ دوسری کلاس میں چلا جائے گا۔"

میں نے کہا: "میں شکایت کرتا ہوں اور میں دوسری کلاس میں جانے کے حوالے سے فکر مند نہیں ہوں۔ میں ساری زندگی اسی کلاس میں ٹھہرنے پر تیار ہوں۔"

اس نے مجھے دیکھا' میری کمر تھپتھپائی اور بولا "تم جو کچھ کر رہے ہو میں اسے سراہتا ہوں میں کل آؤں گا۔"

پھر میں میونسپل کمیٹی کے صدر سے ملنے دوڑا جو محض گائے کا گوبر ثابت ہوا۔ اس نے مجھے کہا: "مجھے خبر ہے۔ اس بارے میں کچھ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ رہنا ہو گا' تمہیں سیکھنا ہو گا کہ اسے کیونکر برداشت کرنا ہے۔"

میں نے اسے کہا اور مجھے اپنے الفاظ ٹھیک ٹھیک یاد ہیں: "میں کسی ایسی چیز کو برداشت نہیں کروں گا جو میرے ضمیر کے مطابق غلط ہو گی۔"

اس نے کہا: "اگر معاملہ یہ ہے تو میں اس کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا ہوں۔ نائب صدر کے پاس جاؤ' ہو سکتا ہے وہ زیادہ مددگار ہو۔ اور اس کے لیے میں اس گائے کے گوبر کا ضرور شکریہ ادا کروں گا کیونکہ اس بستی کا نائب صدر شمبھو دوبے میرے تجربے کے مطابق ساری بستی میں واحد قابل قدر انسان ثابت ہوا۔ جب میں نے اس کے دروازے پر دستک دی ہے ___ تو اس وقت میری عمر محض آٹھ یا نو برس رہی ہو گی اور وہ نائب صدر تھا ___ وہ پکارا: "اندر چلے آؤ۔" وہ کسی کا منتظر تھا اور مجھے دیکھ کر وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

میں نے کہا: "معافی چاہتا ہوں کہ میں قدرے بڑا نہیں ہوں ___ براہ مہربانی مجھے معاف کر دیجئے گا۔ مزید یہ کہ میں بہرحال تعلیم یافتہ بھی نہیں ہوں لیکن مجھے اس آدمی کنٹر ماسٹر کے بارے میں شکایت کرنی ہے۔"

جس وقت اس نے میری کہانی سنی ___ کہ یہ آدمی پہلی جماعت کے بچوں کی

انگلیوں کے درمیان پنسلیں پھنساتا ہے اور پھر دبا کر تشدد کرتا ہے اور یہ کہ اس کے پاس سوئیاں ہیں جنہیں وہ ناخنوں کے اندر چبھو دیتا ہے___ تو اسے یقین نہیں آیا۔

اس نے کہا: ''میں نے افواہیں تو سنی ہیں لیکن کسی نے شکایت کیوں نہیں کی؟

میں نے کہا: ''لوگ خوف زدہ ہیں کہ ان کے بچوں پر زیادہ تشدد کیا جائے گا۔''

وہ بولا: ''کیا تم خوف زدہ نہیں ہو؟''

میں نے کہا: ''نہیں' اس کی وجہ یہ ہے کہ میں فیل ہونے کو تیار ہوں۔ یہی کچھ وہ کر سکتا ہے۔'' میں نے کہا کہ میں فیل ہونے کو تیار ہوں اور میں کامیابی پر مُصر نہیں ہوں لیکن میں آخر تک لڑوں گا: ''یا تو یہ آدمی رہے گا یا میں___ ہم دونوں ایک ہی عمارت میں نہیں رہ سکتے ہیں۔''

شمبھو دوبے نے مجھے اپنے قریب بلایا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر بولا: ''میں ہمیشہ باغیوں سے محبت کرتا ہوں لیکن میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تمہاری عمر کا بچہ بھی باغی ہو سکتا ہے۔ میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں۔''

ہم دوست بن گئے اور یہ دوستی اس کی موت تک برقرار رہی۔ اس بستی کی آبادی بیس ہزار افراد پر مشتمل تھی لیکن ہندوستان میں یہ چھوٹی سی بستی ہی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں جب تک کسی بستی کی آبادی ایک لاکھ افراد پر مشتمل نہیں ہوتی اسے قصبہ نہیں سمجھا جاتا۔ جب پندرہ لاکھ افراد ہوں تو اسے شہر کہا جاتا ہے۔ میں ساری زندگی اس بستی میں شمبھو دوبے جیسے رتبے' صلاحیت یا جوہر (ٹیلنٹ) والے کسی دوسرے شخص سے نہیں ملا۔ اگر تم مجھ سے پوچھو تو تمہیں یہ لفاظی لگے گی لیکن درحقیقت پورے ہندوستان میں نے کوئی دوسرا شمبھو دوبے نہیں پایا۔ وہ تو بس نادر و نایاب تھا۔

جب میں ہندوستان بھر میں سفر کر رہا تھا تو وہ مہینوں میرا انتظار کرتا رہتا کہ میں آؤں اور صرف ایک دن کے لیے بستی کا چکر لگاؤں۔ وہ واحد شخص تھا جو اس وقت مجھے ملنے آتا تھا جب میری ٹرین بستی سے گزرا کرتی تھی۔ ٹھیک ہے میں اپنے ماں اور باپ کو شامل نہیں کر رہا ہوں کہ انہوں نے تو آنا ہی ہوتا تھا___ لیکن شمبھو دوبے میرا رشتہ دار نہیں تھا' وہ تو بس مجھ سے محبت کرتا تھا اور یہ محبت اس ملاقات میں شروع ہوئی تھی' اس دن جب میں کنٹر ماسٹر کے خلاف احتجاج کرنے گیا تھا۔

شمبھو دوبے میونسپل کمیٹی کا نائب صدر تھا اور اس نے مجھے کہا: ''فکر مت کرو۔ اس شخص کو سزا ملے گی۔ درحقیقت اس کی ملازمت ختم ہو گئی ہے۔ اس نے توسیع کے لیے درخواست دی ہوئی ہے لیکن ہم اسے توسیع نہیں دیں گے۔ کل سے تم اسے اس سکول میں

دوبارہ نہیں دیکھو گے۔''

میں نے کہا: ''کیا یہ وعدہ ہے؟''

ہم نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ ہنسنے لگا اور بولا: ''ہاں' یہ وعدہ ہے۔''

اگلے روز کنٹر ماسٹر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ مجھ سے نظر ملانے کا اہل نہیں رہا تھا۔ میں نے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی' کئی مرتبہ اس کے دروازے پر دستک دی' صرف الوداع کہنے کے لیے لیکن وہ حقیقتاً بزدل تھا' شیر کی کھال میں بھیڑ' لیکن سکول کا وہ پہلا دن بہت سے امور کا موثر ثابت ہوا.....

پھر جب میں نے میٹرک پاس کی ہے تو سارا خاندان زبردست مشکل میں تھا کیونکہ وہ سب کچھ نہ کچھ چاہتے تھے۔ کوئی چاہتا تھا کہ میں ڈاکٹر بنوں' کسی کی خواہش تھی کہ میں سائنس داں بنوں' کوئی چاہتا تھا میں انجینئر بنوں___ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں یہ باعزت پیشے ہوتے ہیں' ان پیشوں میں پیسہ ہوتا ہے۔ تم امیر ہو سکتے ہو' تم مشہور و معروف ہو سکتے ہو' تم معزز ہو سکتے ہو۔ لیکن میں نے کہا: ''میں فلسفہ پڑھوں گا۔''

ان سب نے کہا: ''کیا بکواس ہے! کوئی عقل مند انسان فلسفہ نہیں پڑھتا ہے۔ اس کے بعد تم آخر کرو گے کیا؟ یونیورسٹی میں چھ سال تک تم وہ چیزیں پڑھو گے جن کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔ ان کی کوئی افادیت نہیں ہے' تم کوئی چھوٹی سی ملازمت بھی نہیں حاصل کر سکو گے۔''

اور وہ درست کہتے تھے۔ ہندوستان میں اگر تم کسی چھوٹی سی ملازمت کے لیے بھی درخواست دو گے' مثلاً ڈاک خانے میں کلرک' جس کے لیے محض میٹرک ہی اہلیت ہوتی ہے۔ جبکہ تم فلسفے میں ماسٹر ڈگری رکھتے ہو' تم یونیورسٹی میں اول آئے ہو' تم نے گولڈ میڈل حاصل کیا ہے___ تو تمہیں رد کر دیا جائے گا۔ صرف انہی باتوں کی وجہ سے! یہ تو نااہلیتیں ہوتی ہیں' تم ایک مشکل انسان ہوتے ہو! کلرک کو فلسفی نہیں ہونا چاہیے ورنہ دشواریاں پیدا ہونا لازم ہے۔

سو انہوں نے کہا: ''تم زندگی بھر مصیبت میں رہو گے اس پر غور کرو۔''

میں نے کہا: ''میں کبھی غور نہیں کیا کرتا تم جانتے ہی ہو۔ میں تو بس دیکھا کرتا ہوں۔ اور ادھر انتخاب کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں کیا پڑھنے جا رہا ہوں___ سوال یہ جانچنے کا نہیں ہے کہ کونسی ملازمت سودمند ثابت ہو گی۔ چاہے میں فقیر ہی ہو جاؤں میں فلسفہ ہی پڑھوں گا۔''

وہ سب حیران تھے۔ انہوں نے مجھے کہا: ''لیکن کیا وجہ ہے کہ تم فلسفہ ہی پڑھنا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا: ''وجہ یہ ہے کہ میں زندگی بھر فلسفیوں سے لڑوں گا___ میں ان کے

بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا ہوں۔"

وہ بولے: "رے بھگوان! یہ ہے تمہارا آدرش؟ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی شخص اس لیے فلسفہ پڑھنا چاہتا ہے کہ وہ ساری زندگی فلسفیوں سے لڑائی کرے گا۔" لیکن وہ جانتے تھے کہ میں سودائی ہوں۔ انہوں نے کہا: "ایسا کچھ ہی متوقع تھا۔" اب بھی وہ اصرار کر رہے تھے۔ "ابھی وقت ہے، تم اب بھی اس پر غور کر سکتے ہو۔ یونیورسٹی ایک ماہ بعد کھلے گی۔ تم اب بھی اپنی سوچ تبدیل کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا: "ایک ماہ، ایک سال، ایک جیون — اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ میرے پاس کوئی انتخاب نہیں ہے۔ یہ میری بے انتخاب ذمہ داری ہے۔"

میرا ایک چچا، جو یونیورسٹی گریجویٹ تھا، بولا "اس سے بات کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ بے انتخابی...... ذمہ داری...... زندگی سے ان چیزوں کا کیا سروکار؟ تمہیں پیسے کی ضرورت ہو گی، تمہیں ایک گھر کی ضرورت ہو گی، تمہیں ایک خاندان کی مدد کی ضرورت ہو گی۔"

میں نے کہا: "میں کوئی خاندان نہیں بناؤں گا۔ میں کوئی گھر نہیں بناؤں گا اور میں کسی کی مدد نہیں کروں گا!" اور میں نے نہ تو کسی کی مدد کی اور نہ ہی گھر بنایا — میں دنیا کا سب سے زیادہ غریب آدمی ہوں!

وہ مجھے ڈاکٹر، انجینئر، سائنسدان بننے کے لیے قائل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے لیکن وہ سب غصے میں تھے۔ اور جب میں ملک بھر میں گھومنے والا استاد بن گیا، وہ کام کرتے ہوئے جس کے لیے میں نے فلسفہ اور منطق پڑھی تھی کیونکہ میں دشمن کی کامل آگہی چاہتا تھا تو جلد ہی کوئی آدمی ایسا نہ رہا جو مجھے چیلنج کر سکتا۔ تب میرے خاندان کو غلطی کا احساس ہونے لگا، یہ احساس کہ اچھا ہی ہوا تھا کہ وہ مجھے ڈاکٹر، انجینئر یا سائنسدان بنانے کے اہل نہیں تھے۔ میں نے ثابت کر دیا کہ وہ غلطی پر تھے۔ وہ مجھ سے کہنے لگے: "ہمیں معاف کر دو۔"

میں نے کہا: "کوئی مسئلہ نہیں ہے کیونکہ میں نے آپ کی نصیحت کو کبھی سنجیدگی سے لیا ہی نہیں تھا۔ میں کبھی پریشان نہیں ہوا! جو کچھ بھی مجھے کرنا تھا، چاہے ہر شے میرے خلاف ہو جاتی مجھے وہی کرنا تھا۔ میں نے کبھی آپ کی نصیحت کو سنجیدگی سے نہیں لیا، میں آپ کو سنتا تو تھا لیکن سنتا نہیں تھا۔ فیصلہ تو میرے اندر تھا، ایک عزم۔"

جب اُسے گیان ملا:

عقیدت مندوں کے بقول 21 سال کی عمر میں، 21 مارچ 1953ء کو رجنیش نے

گیان پایا، اب وہ اُس شعورِ مطلق سے سرفراز تھا جو اُس کے ماننے والوں کے مطابق انسانی فہم و فراست کی انتہائی منزل ہے۔ یہ عجیب و غریب واقعہ کب اور کیسے رونما ہوا؟ آیئے! اوشو ہی کی زبانی سنتے ہیں:

اکیس مارچ 1953ء سے صرف سات دن پہلے میں نے اپنے اوپر کام کرنا روک دیا تھا۔ ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب تم کوشش کی ساری عبثیت کو دیکھتے ہو۔ تم نے وہ سب کیا ہوتا ہے جو کہ تم کر سکتے ہو اور کچھ بھی رونما نہیں ہوتا۔ تم نے وہ سب کیا ہوتا ہے جو انسان کے لیے ممکن ہو۔ تب پھر تم کیا کر سکتے ہو؟ شدید بے بسی و لاچاری کی کیفیت میں انسان ساری تلاش ترک کر دیتا ہے۔ اور جس روز تلاش ختم ہوئی، جس روز میں کسی شے کو تلاش نہیں کر رہا تھا، جس روز میں کسی شے کے رونما ہونے کا انتظار نہیں کر رہا تھا، یہ رونما ہونے لگی۔ ایک نئی توانائی ابھری — کہیں سے بھی نہیں۔ یہ کسی سرچشمے سے نہیں اندی تھی۔ یہ کہیں سے نہیں آ رہی تھی اور ہر کہیں سے آ رہی تھی۔ یہ درختوں میں تھی، چٹانوں میں، آسمانوں میں، سورج میں، ہوا میں — یہ ہر کہیں تھی۔ میں بہت زیادہ تلاش کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ کہیں دور پرے ہے — اور یہ تو اس قدر نزدیک تھی، اس قدر قریب تھی! آنکھیں دور پرے افق پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اسے دیکھنے کی اہلیت کھو چکی تھیں جو کہ پاس ہی تھا۔

جس روز کوشش رکی، میں بھی رک گیا —

وہ سات روز حیرت ناک قلب ماہیت، مکمل قلب ماہیت کے تھے۔ اور آخری دن ایک مکمل طور پر نئی توانائی، ایک نئی روشنی اور نئی مسرت کی موجودگی اس قدر شدید تھی کہ وہ قریب قریب ناقابلِ برداشت تھی — گویا میں پھٹنے والا تھا، گویا میں سرشاری کی زیادتی سے پاگل ہونے والا تھا۔ مغرب کی نوجوان نسل اس کا موزوں طور پر اظہار کرتی ہے — میں تو سن ہو کر رہ گیا، خوشی میں آپے سے باہر ہو گیا۔

یہ بیان کرنا ناممکن ہے کہ کیا رونما ہو رہا تھا۔ وہ ایک انوکھی دنیا تھا — اس کو بیان کرنا مشکل ہے، اس کی درجہ بندی کرنا مشکل ہے۔ لفظوں کو، زبان کو، توضیحات کو استعمال کرنا دشوار ہے۔ تمام صحیفے مردہ دکھائی دیتے تھے اور اس تجربے کے لیے استعمال ہونے والے سارے لفظ بہت پھیکے دکھائی دیتے تھے۔ یہ بے حد زندہ تھا۔ یہ رحمت کی اٹھتی ہوئی لہر کے مانند تھا۔

وہ سارا دن ہی انوکھا، منجمد کر دینے والا تھا اور وہ ایک پاش پاش کر دینے والا تجربہ تھا۔ ماضی یوں معدوم ہو رہا تھا گویا کبھی اس کا مجھ سے ربط ہی نہیں رہا ہو، گویا میں نے اس کے بارے میں کہیں پڑھا ہو۔ گویا میں نے اس کا خواب دیکھا ہو، گویا یہ کسی اور شخص کی کہانی

تھی جو میں نے سنی تھی۔ میں اپنے ماضی سے چھوٹ رہا تھا' میری جڑیں اپنی تاریخ سے اکھڑ رہی تھیں۔ میں اپنی آپ بیتی کھو رہا تھا۔ میں لاموجود بن رہا تھا' جسے بدھ ''ان اتا'' کہتا ہے۔ حدود معدوم ہو رہی تھیں' امتیازات مٹ رہے تھے۔

ذہن معدوم ہو رہا تھا' وہ لاکھوں میل دور پرے تھا۔ اس کو گرفت کرنا دشوار تھا' وہ تیزی سے دور سے دور تر ہوتا جا رہا تھا اور اسے قریب رکھنے کی آرزو بھی نہیں تھی۔ میں اس سب سے بے نیاز سا تھا۔ سب ٹھیک تھا___ ماضی کے تسلسل کو برقرار رکھنے کی کوئی آرزو نہیں تھی___ شام تک یہ حالت ہوگئی کہ اسے برداشت کرنا دشوار ہو گیا___ وہ اذیت دہ تھا' وہ درد انگیز تھا۔ وہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی عورت بچے جنتی ہے' جب بچہ پیدا ہونے والا ہوتا ہے اور عورت بے پناہ درد سے گزرتی ہے___ دردِ زہ سے۔

میں ان دنوں رات کو بارہ یا ایک بجے سویا کرتا تھا لیکن اس روز جاگتے رہنا ناممکن ہوگیا تھا۔ میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں' انہیں کھلا رکھنا دشوار ہوا جا رہا تھا۔ کوئی شے سر پر کھڑی تھی' کچھ ہونے والا تھا۔ یہ کہنا دشوار تھا کہ یہ تھا کیا___ ہوسکتا ہے یہ میری موت ہی ہو___ لیکن کوئی خوف نہیں تھا میں تو اس کے لیے آمادہ و تیار تھا۔ وہ سات دن اتنے خوبصورت گزرے تھے کہ میں مرنے کو بھی تیار تھا' مزید کچھ مطلوب جو نہیں تھا۔ وہ دن بے انتہا مسرت انگیز رہے تھے' میں اتنا مطمئن اور آسودہ تھا کہ اگر موت بھی آتی تو میں اسے خوش آمدید کہتا۔

تاہم کچھ ہونے والا تھا___ کوئی شے موت جیسی' کوئی شے بہت ہولناک' کوئی شے جو یا تو موت ہوسکتی تھی یا نیا جنم' مصلوب ہونا یا تناسخ___ کوئی حیرت انگیز اہمیت والی شے وہیں کہیں نزدیک ہی تھی اور میرے لیے اپنی آنکھوں کو کھلا رکھنا ناممکن تھا' میں نشے میں تھا۔

میں آٹھ بجے کے لگ بھگ سونے چلا گیا۔ اب میں سمجھ سکتا تھا کہ جب پتانجلی کہتا ہے کہ نیند اور سمادھی یکساں ہیں تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ فرق صرف اور صرف ایک ہوتا ہے___ اور وہ یہ کہ سمادھی میں تم مکمل طور پر بیدار بھی ہوتے ہو اور سوئے ہوئے بھی ہوتے ہو___ بیک وقت بیدار بھی' خوابیدہ بھی۔ سارا جسم پرسکون ہوتا ہے' جسم کا ہر ایک خلیہ مکمل طور پر پرسکون ہوتا ہے۔ تمام فعلیت' کارکردگی پرسکون ہوتی ہے اور اس پر بھی بیداری کی ایک شمع تمہارے اندر روشن رہی ہے___ شفاف' بے دھواں۔ تم چوکس بھی ہوتے ہو اور پرسکون بھی' ڈھیلے ڈھالے لیکن مکمل طور پر بیدار۔ جسم جتنی گہری نیند ممکن ہے اس میں ہوتا ہے اور تمہارا شعور اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ شعور کی چوٹی اور جسم کی وادی کا ملاپ ہو جاتا ہے۔

میں سو گیا۔ وہ ایک بہت عجیب سی نیند تھی۔ جسم سو رہا تھا' میں جاگ رہا تھا۔ یہ اس

قدر عجیب تھا___ گویا کوئی دو سمتوں' دو جہتوں میں تقسیم ہو جائے' جیسے قطبیت مکمل طور پر واقع ہوگئی ہو' گویا میرے اندر دونوں قطب بہم ہو گئے ہوں___ مثبت اور منفی مل رہے تھے' نیند اور بیداری مل رہی تھیں' موت اور زندگی مل رہی تھیں۔ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب تم کہہ سکتے ہو کہ تخلیق کرنے والا اور تخلیق ملتے ہیں۔

یہ انوکھا سا تھا۔ پہلی دفعہ تو یہ تمہیں تمہاری بنیادوں تک ہلا دیتا ہے' یہ تمہاری جڑیں ہلا دیتا ہے۔ تم اس تجربے کے بعد ویسے ہی نہیں رہتے ہو' یہ تمہاری زندگی میں ایک نئی بصیرت' ایک نئی کیفیت لاتا ہے۔

یہ اس قدر حقیقی تھا کہ باقی ہر شے غیر حقیقی ہوگئی تھی۔ کمرے کی دیواریں غیر حقیقی ہوگئی تھیں' گھر غیر حقیقی ہو گیا تھا' خود میرا جسم غیر حقیقی ہو گیا تھا۔ ہر شے غیر حقیقی تھی کیونکہ حقیقت پہلی مرتبہ موجود ہوئی تھی۔

اس شب پہلی مرتبہ مجھے لفظ ''مایا'' کا مفہوم سمجھ میں آیا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ میں اس سے قبل اس لفظ سے آگاہ نہیں تھا' ایسا بھی نہیں تھا کہ میں اس لفظ کے معانی سے آگاہ نہیں تھا۔ جس طرح تم آگاہ ہوتے ہو' میں بھی معانی سے آگاہ تھا___ لیکن میں اس سے قبل اسے کبھی سمجھ نہیں پایا تھا۔ بغیر تجربے کے تم کیسے سمجھ سکتے ہو؟ اس شب ایک اور حقیقت نے اپنے دروازے وا کر دیے تھے' ایک اور جہت میسر ہوگئی تھی۔

میرے اندر زبردست آرزو ابھری کہ میں کمرے سے نکل بھاگوں' کھلے آسمان تلے چلا جاؤں___ اس سے میرا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ بہت بہت سی تھی! یہ تو مجھے مار دے گی! اگر میں چند ہی لمحے مزید رہا تو میں خود اپنا دم گھوٹ لوں گا___ ایسا ہی دکھائی دیتا تھا۔ میں کمرے سے نکل بھاگا' باہر گلی میں آ گیا۔ ایک زبردست آرزو تھی کہ کھلے آسمان تلے ستاروں کے ساتھ رہوں' درختوں کے ساتھ' زمین کے ساتھ___ فطرت کے ساتھ ہوؤں۔ اور میں جونہی باہر نکلا دم گھٹنے کا احساس جاتا رہا۔

وہ ایسے بڑے تجربے کے لیے بہت ہی چھوٹی جگہ تھی۔ اس بڑے تجربے کے لیے تو آسمان بھی بہت ہی چھوٹی جگہ ہوتی ہے۔ یہ تو آسمان سے عظیم تر ہے۔ حتیٰ کہ آسمان بھی اس کی حد نہیں ہے۔ تاہم یوں مجھے زیادہ سکون محسوس ہوا تھا۔

اور اس روز وہ شے رونما ہوئی جو کہ جاری تھی___ تسلسل کے طور پر نہیں بلکہ وہ داخلی بہاؤ کے طور پر ہنوز جاری تھی۔ استقلال کے طور پر نہیں___ یہ تو ہر لحظہ بار بار رونما ہوتے چلی جا رہی تھی۔

اور اس رات سے میں جسم میں کبھی نہیں رہا ہوں۔ میں تو اس کے گرد منڈلاتا رہا

ہوں۔ میں بیک وقت انتہائی طاقت ور اور نہایت نازک بن گیا ہوں۔

تدریسی سرگرمیاں' اور استعفیٰ:

پہلے تو اوشو رائے پور کے سنسکرت کالج میں تدریسی خدمات انجام دیتا رہا اور ایک سال بعد جبل پور یونیورسٹی میں فلسفہ کا پروفیسر مقرر ہوا لیکن 1966ء میں اُس نے اپنے عہدے سے رضاکارانہ طور پر سبکدوش ہونے کا فیصلہ کیا تاکہ اپنی "روحانی بیداری" سے لاکھوں سوئے ہوئے لوگوں" کو مستفید کر سکے۔ اب وہ نئے دور کے نئے انسان کو مراقبے کی خودساختہ اقسام کے اسرار و رموز سے آگاہ کرنے کے کام میں پوری طرح متحرک ہو گیا۔

عوامی بیداری کی جدوجہد:

بیسویں صدی کے لگ بھگ پورے چھٹے عشرے کے دوران اُس نے آچاریہ رجنیش کے روپ میں بھارت کے طول و عرض کے دورے کیے۔ آچاریہ کون ہوتا ہے اور اوشو کو یہ خطاب کیسے ملا؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے وہ کہتا ہے:

سو جب چونتیس برس پہلے میں نے بات کرنا شروع کیا تو لوگوں نے اس لفظ کو استعمال کرنا شروع کر دیا ..... اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں اگر تم کسی شخص کا احترام کرتے ہو تو تم اس کا نام استعمال نہیں کرتے ہو' اس کو بے توقیری تصور کیا جاتا ہے۔ سو جب میں نے تقریریں کرنا شروع کیا اور لوگوں نے میرے بارے میں کچھ محسوس کرنا شروع کیا تو وہ خود بخود مجھے "اچاریہ" کہہ کر پکارنے لگے۔ "اچاریہ" کا مطلب ہوتا ہے "استاد" ــــ تاہم اس کا مطلب محض استاد نہیں ہے' بلکہ اس سے کچھ سوا ہے۔ درحقیقت اس کا مطلب ہے: ایک ایسا شخص جو وہی کہتا ہے جسے وہ جیتا ہے' ایک ایسا شخص جس کے اعمال اور افکار مطلقاً ہم آہنگی میں ہوں۔ سو قریباً بیس برس تک لوگ مجھے "اچاریہ" کہتے رہے۔ یہ اس سے پہلے کی بات ہے جب میں نے لوگوں کو عملی سبق دینے شروع کیے۔

رجنیش کے عقیدت مند کہتے ہیں کہ ہمارے گرو نے بھارت کے ہر علاقے میں اجتماعات اور مراقبوں کی تربیتی محفلیں منعقد کر کے دھرم کے نام پر اپنے ذاتی مقاصد کی تکمیل کرنے والے انسان دشمنوں کی ریاکاری اور منافقت کا بھانڈا بیچ چوراہے کے پھوڑ دیا۔ وہ لوگوں کو آگاہ کرتا رہا کہ کس طرح مذہب کی آڑ میں کچھ منافق لوگ انسان کو روحانی طور پر طاقتور بننے کے استحقاق سے محروم کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ان سرگرمیوں سے لاکھوں لوگ ذہنی طور پر لرز کر رہ گئے۔

جب وہ بھگوان بنا:

ملک گیر دورے کے بعد اوشو نے تیزی کے ساتھ عملی سمت میں آگے بڑھنا شروع کیا۔ 27 جون 1970ء کو جبل پور میں اس کے لیے ایک الوداعی تقریب کا اہتمام کیا گیا' وہ اس شہر میں کئی برس تک فلسفہ کے پروفیسر کی حیثیت سے مقیم رہا تھا' اور اب بمبئی کی رونق بڑھانے پر آمادہ تھا۔ یکم جولائی کو وہ بمبئی چلا جاتا ہے اور قریباً پچاس افراد کو باقاعدگی سے شام کے وقت خطاب کرتا ہے۔ اس محفل کا اختتام اکثر اوقات مراقبے' موسیقی اور رقص پر ہوتا تھا۔ اسی سال رجنیش نے مراقبے کی ایک انقلابی تطہیری تکنیک کا تعارف پیش کیا اور سنیاس کے روایتی تصور کو نیا جامہ پہنایا۔ 26 ستمبر 1970ء سے لے کر 5 اکتوبر 1970ء تک ہمالیہ کی وادی میں کولومنالی نامی مقام پر ایک مراقبہ کیمپ کا انعقاد کیا گیا۔ 26 ستمبر ہی کو اوشو نے اپنے خاص چیلوں یا مریدوں کی اولین جماعت قائم کی' ان لوگوں کو وہ نو سنیاسی قرار دیتا تھا۔ اسی طرح سنیاس کی قدیم ہندوستانی روایت کو بھی اس نے "نو سنیاس" کے نام سے بالکل روایت شکن معنوں میں بیان کیا۔ اس حوالے سے اُس کا کہنا تھا کہ

"میں مستقبل کے سنیاس کو ماضی کے سنیاس سے الگ کر دوں گا۔ اور میرا خیال ہے کہ سنیاس کا ادارہ جیسا کہ وہ اب تک چلا آ رہا ہے' بستر مرگ پر ہے' یہ مردے کی طرح ناکارہ ہے۔ اس کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ لیکن سنیاس کے جوہر کو محفوظ کرنا ہوگا۔ یہ انسانیت کا اتنا قیمتی حاصل ہے کہ ہمیں اس کو کھونے کا یارا نہیں ہے۔ سنیاس ان کمیاب پھولوں میں سے ایک ہے جو ہزاروں سال بعد کھلتے ہیں۔ لیکن ایسا ہے کہ مناسب دیکھ بھال کی کمی کے سبب یہ مرجھا جائے گا ــــ اور اگر یہ اپنے قدیم تانوں بانوں سے ہی بندھا رہتا ہے تو یہ یقینی طور پر فنا ہو جائے گا۔

سنیاس کے قدیم معانی ہیں دنیا کو ترک کر دینا۔ میں اس کے خلاف ہوں۔

تاہم میں ہنوز لفظ "سنیاس" کو استعمال کرتا ہوں' اس کی وجہ یہ ہے کہ پرانے معانی کی نسبت کہیں زیادہ اہمیت کے حامل دیگر معانی کو دیکھ سکتا ہوں۔ میری مراد ان جکڑ بندوں کو ترک کرنے سے ہے جو کہ دنیا نے تمہیں دیئے ہیں ــــ تمہارا دھرم' تمہاری ذات پات' تمہاری برہمنیت' تمہارا جین مت' تمہاری عیسائیت' تمہارا بھگوان' تمہاری پوتر پستک۔

میرے لیے سنیاس کا مطلب ہے ایک وابستگی' ایک وعدہ کہ "میں ان سب چیزوں کو اپنے اندر سے مکمل طور پر صاف کر دوں گا جو کہ مجھ پر تھوپی جاتی رہی ہیں اور میں اپنے بھروسے جینا شروع کروں گا ــــ تازہ' جواں' خالص' غیر آلودہ" سو سنیاس تمہاری اپنی

معصومیت میں باضابطہ شمولیت ہے۔"

بہرحال اس "نو سنیاس" کو اپنانے والے "نو سنیاسیوں" کی تعداد بڑھتی گئی۔ اوشو کے عقیدت مندوں کے بقول یہ خودشناسائی اور مراقبے کے لیے درکار اعلیٰ درجے کے تصور کا حقیقی راستہ تھا جو جدید دور کے ہندوستانیوں کو پہلی بار دکھایا گیا۔ اس معاملے میں جذباتی طور پر زیادہ متاثر ہونے والوں کو گرو سے ان کی محبت کی شدت اور انفرادی لگن کی بنیاد پر ہر طرح کا تعاون فراہم کیا جاتا تھا۔ بعدازاں تعاون حاصل کرنے والے ان "شدید متاثرین" نے ہی رجنیش کو گرو یا آچاریہ سے بھی بلند درجہ دے کر "بھگوان" کہنا شروع کر دیا۔ بھگوان کیا ہوتا ہے؟ اور اوشو کیوں، کب اور کیسے بھگوان بنا؟ اس سوال کا جواب بھی اوشو ہی کی زبانی سنیے:

تنقید کرنے والوں نے، جو کہ میرے خلاف لکھتے رہے ہیں، ہمیشہ اس کو ایک الزام بنایا ہے کہ میں ایک "خودساختہ" بھگوان ہوں۔ اور میں ہمیشہ حیرت کرتا رہا ہوں، کیا وہ کسی کو بھی جانتے ہیں ـــ رام، کرشن، بدھ ـــ جس کو کسی دوسرے نے مقرر کیا ہو؟ اگر رام کو کسی اور نے "بھگوان" مقرر کیا تھا تو یقینی طور پر مقرر کرنے والی اتھارٹی زیادہ بڑی ہوئی ـــ اور اگر تم مقرر ہو سکتے ہو تو تم ہٹائے بھی جا سکتے ہو!

یہ تو نری حماقت ہے۔ بنیادی طور پر وہ اس تصور ہی کو نہیں سمجھے یعنی بھگوان تو تجربے کی ایک حالت ہوتا ہے ـــ اس کا تقرر سے، انتخاب سے، خطاب سے یا ڈگری سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہ تو بھگوت کا تجربہ ہے، بھگوانیت (Godliness) کا، کہ ساری ہستی بھگوانیت سے بھری ہوئی ہے، کہ بھگوانیت کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔

کوئی بھگوان نہیں ہے لیکن ہر پھول میں اور ہر درخت میں، ہر پتھر میں کوئی شے ایسی موجود ہے جس کو صرف بھگوانیت ہی کہا جا سکتا ہے۔ تاہم تم اسے صرف تبھی دیکھ سکتے ہو جب تم اسے اپنے اندر دیکھ چکے ہو، ورنہ تم زبان نہیں جانتے ہو۔

میں ایک طور سے بہت عجیب ہوں کیونکہ تم میری قسم بندی نہیں کر سکتے ادھر تین قسمیں ہوتی ہیں بھگوان کو ماننے والے، دہریے، تشکیک پسند۔ کوئی چوتھی قسم نہیں ہے ـــ اور میں چوتھی قسم سے تعلق رکھتا ہوں، بے نام قسم سے۔ میں نے دیکھا ہے، ڈھونڈا ہے۔ مجھے بھگوان، سچ نہیں ملا لیکن میں نے بہت زیادہ اہم شے پالی: بھگوانیت۔

میں کوئی دہریہ نہیں ہوں، میں کوئی بھگوان کو ماننے والا نہیں ہوں، میں کوئی تشکیک پسند نہیں ہوں۔ میری حالت تو بالکل واضح ہے۔

سو اگر کوئی بھگوان نہیں ہے تو مجھے میرے لوگ بھگوان کیوں پکارتے ہیں؟

یہ سوال اک ذرا سا پیچیدہ ہے۔ تمہیں لفظ بھگوان کی لسانیات میں جانا ہوگا۔ یہ

ایک بے حد انوکھا لفظ ہے۔ ہندو صحیفوں میں بھگوان خدا کا قریباً مترادف ہے۔ میں کہتا ہوں قریباً، کیونکہ انگریزی زبان میں صرف ایک ہی لفظ ہے، خدا (God)۔ سنسکرت میں، ہندومت میں تین الفاظ ہیں: ایک ہے بھگوان، دوسرا ہے ایشور، تیسرا ہے پرماتما۔ ہندو ان تین لفظوں کو تین مختلف وجوہات کے تحت استعمال کرتے ہیں۔

پرماتما کا مطلب ہے "اعلیٰ ترین روح۔" پرم کا مطلب ہے "اعلیٰ ترین" اور آتما کا مطلب ہے "روح"۔ لہٰذا پرماتما کا مطلب ہوا "اعلیٰ ترین روح"۔ چنانچہ جو لوگ حقیقتاً سمجھتے ہیں وہ خدا (God) کے لیے لفظ پرماتما استعمال کرتے ہیں۔

دوسرا لفظ ایشور ہے۔ یہ ایک خوب صورت لفظ ہے۔ ایشور کا مطلب ہے "سب سے زیادہ امیر"... لفظی طور پر اس کا مطلب ہوا: وہ جس کے پاس سب کچھ ہو، جو سب کچھ ہو۔ یقینی طور پر یہ سچ ہے۔ جس لمحے تم بھگوانیت کا تجربہ کرتے ہو تو تم ہر شے کے حامل ہو جاتے ہو، ہر اس شے کے جو کسی قدر و قیمت کی حامل ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ تمہارے پاس کوئی بھی شے نہ ہو، اس کی چنداں اہمیت نہیں ہے لیکن تم ہر شے کے حامل ہوتے ہو جو زندگی کے لیے کوئی خصوصیت رکھتی ہو۔

اور تیسرا لفظ ہے بھگوان۔ بھگوان کو کسی دوسری زبان میں سمجھنا یا سمجھانا بہت دشوار ہے۔ ہندو صحیفوں میں... اسے یاد رکھنا، کیونکہ بھگوان کو ہندوستان میں دو قسم کے لوگ استعمال کرتے ہیں: اول، ہندو؛ دوم: جین اور بدھ۔ جین اور بدھ خدا (God) کو نہیں مانتے ہیں، تاہم وہ لفظ بھگوان کو استعمال کرتے ہیں۔ بدھ مت کے پیروکار بدھ کے لیے لفظ بھگوان استعمال کرتے ہیں... بھگوان گوتم بدھ۔ اور جین بھی خدا (God) کو نہیں مانتے ہیں تاہم وہ مہاویر کے لیے استعمال کرتے ہیں بھگوان وردھمن مہاویر۔ لہٰذا ان کے معانی مکمل طور پر مختلف ہیں۔

ہندو بہت حقیقت پسند ہوتے ہیں۔ تمہیں حیرت ہوگی، بلکہ تمہیں دھچکا سا لگے گا تاہم ہندومت میں بھگوان کی اصل جڑ بھگ ہے ـــ بھگ کا مطلب ہوتا ہے "اندام نہانی"۔ تم نے تو سوچا بھی نہیں ہوگا! اور بھگوان کا مطلب ہے "وہ جو کائنات کی اندام نہانی کو تخلیق کے لیے استعمال کرتا ہو"... تخلیق کرنے والا۔ ہندو عورت کی اندام نہانی اور مردانہ عضوِ تناسل کی علامت "شولنگ" کی پوجا کرتے ہیں۔ شاید تم نے شولنگ دیکھا ہو، یہ سنگِ مر مر کا ایک مخروطی ابھار سا ہوتا ہے جو کہ مردانہ جنسی عضو کی بس ایک علامت ہوتا ہے اور یہ اندام نہانی میں کھڑا ہوتا ہے۔ اگر تم اس کے نیچے دیکھو گے تو تمہیں سنگِ مرمر کی اندام نہانی نظر آئے گی، اس کے اندر سے یہ (شولنگ) ابھر رہا ہوتا ہے۔ ہندو علامتی طور پر اس کی پوجا

کرتے ہیں اور ان کے حوالے سے یہ بامعنی دکھائی پڑتا ہے کہ ہر تخلیق مرد اور عورت کے ین اور یانگ کے ملاپ ہی سے ہوتی ہے۔ سو "تخلیق کرنے والے" کے لیے وہ لفظ "بھگوان" استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اس لفظ کا ماخذ (Origin) بہت عجیب ہے۔

بدھ اور جین خدا (God) کو نہیں مانتے ہیں' وہ یقین نہیں رکھتے ہیں کہ دنیا کو کسی نے تخلیق کیا ہے تاہم وہ بھی لفظ بھگوان کو استعمال کرتے ہیں۔ ان کے ہاں اس لفظ کا ماخذ مختلف ہے۔ جین اور بدھ تناظر میں "بھگ" کا مطلب ہوتا ہے "قسمت" اور بھگوان کا مطلب ہوتا ہے: "قسمت والا' وہ جسے نوازا گیا ہو۔" وہ جس کو اپنی منزل حاصل ہوگئی' وہ جو پختہ اور کامل اور بالغ ہوگیا ہو۔

برسوں لوگ مجھے کہتے رہے تھے کہ وہ میرے ویسے سنیاس کے عملی سبق لینا چاہتے ہیں اور میں انہیں کہتا تھا: "انتظار کرو۔ وہ لمحہ آنے دو جب میں خود اسے موزوں محسوس کروں گا۔" وہ دن آ گیا۔ میں نے ہمالیہ کی وادی میں کولو منالی میں ایک مراقبہ کیمپ کا انعقاد کیا۔۔۔ کولومنالی دنیا کی خوبصورت ترین جگہوں میں سے ایک جگہ ہے۔ اس کو دیوتاؤں کی وادی کہا جاتا ہے' یہ بے حد خوب صورت ہے' یہ تو کوئی دوسری ہی دنیا لگتی ہے۔ ایک مرتبہ تم کولومنالی میں داخل ہو جاؤ تو تمہیں محسوس ہوگا کہ تم کسی اور ہی دنیا میں داخل ہو چکے ہو۔ کیمپ کے آخری روز وہ لمحہ مجھ پر وارد ہوگیا: "اب وقت آ گیا ہے۔" اور میں نے اعلان کیا: "جو کوئی بھی عملی سبق لینا چاہتا ہے' میں آمادہ ہوں۔" بیس افراد فوری طور پر کھڑے ہوگئے۔ وہ سنیاس میں داخل ہوگئے۔ اب ان کے لیے مسئلہ تھا کہ وہ مجھے کس نام سے بلائیں۔ ہر شخص مجھے اچاریہ کہا کرتا تھا' لیکن اب یہ لفظ ان کے لیے کافی نہیں تھا۔ ان کے لیے تو میں کہیں زیادہ اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ بہت زیادہ خاص' بہت زیادہ قریب ہوگیا تھا۔ وہ میری ہستی کے بہت قریب آ چکے تھے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ مجھے بھگوان کہا کریں گے۔

انہوں نے مجھ سے دریافت کیا تھا۔ میں نے کہا: "یہ کاملاً درست ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے لیے یہ بہت بامعنی لفظ ہے: "ایسا شخص جس کو نوازا گیا ہو۔"

مغرب میں مقبولیت:

ابتداء میں مغربی ممالک سے جو شخص "نوسنیاس" کا شہرہ سن کر ہندوستان وارد ہوئے' اُن میں زیادہ تر ماہرین روحانیات اور تصوف کے موضوع پر سند کا درجہ رکھنے والے مشہور و معروف لوگ تھے لہٰذا ان کے ذریعے اوشو کی شہرت امریکہ' آسٹریلیا اور جاپان وغیرہ تک جا پہنچی۔ ماہانہ مراقبہ کیمپوں کا باقاعدہ اہتمام کافی عرصے سے جاری تھا لیکن اب پونا میں

ایک نئی جگہ تلاش کی گئی تاکہ جاری سرگرمیوں کو مزید وسعت دی جاسکے۔

پونا کی سرگرمیاں:

گزشتہ سطور میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ رجنیش نے 21 مارچ 1953ء کو گیان پایا۔ اسی "یوم آگہی" کی اکیسویں سالگرہ پر پونا میں "شری رجنیش آشرم" کا افتتاح ہوا۔ اس مقصد کے لیے اوشو نے پونا میں چھ ایکڑ رقبے پر محیط دو رہائش گاہیں خریدیں۔ اب وہ اپنی روزمرہ مصروفیات کو نئے سرے سے ترتیب دینے کے بعد ہر روز صرف انہی لوگوں سے ملتا یا گفتگو کرتا جو آشرم میں نو وارد ہوتے یا بعداز قیام رخصت ہو رہے ہوتے۔ باقی عقیدت مندوں کو "مستقل دیدار کی نعمت" سے یہ کہہ کر محروم کر دیا گیا کہ "ایسا بہت سوچ سمجھ کر کیا گیا ہے کہ میں ناقابل رسائی ہو جاؤں۔ میں تو بہت ہی قابل رسائی تھا لیکن پھر رفتہ رفتہ میں نے محسوس کیا کہ میں (تمہیں ہر وقت) مدد نہیں دے سکتا' ایسا کرنا قریب قریب ناممکن ہوگیا تھا۔ مثال کے طور پر اگر میں تمہیں ایک گھنٹہ دیتا ہوں تو تم بکواس کرنے لگتے ہو۔ اگر میں تمہیں ایک منٹ دیتا ہوں تو تم صرف وہی بات کہتے ہو جس کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذہن اس طرح کرتا ہے کام۔"

مئی 1974ء میں اوشو نے انگریزی خطبات کا ایک سلسلہ شروع کیا اور اپنی فکر کی تفصیلی وضاحت کی بعدازاں ان خطبات کی کتابی صورت میں اشاعت نے مغربی لوگوں کی بڑی تعداد کو اوشو کے خیالات و افکار تسلیم کرنے کی ترغیب دی اور سچ بھی یہی ہے کہ ان دنوں دنیا بھر میں اس کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اس مثالی صورتحال میں خرابی یہ آئی کہ وہ دن بدن کمزور ہوتا چلا گیا' صحت شدید متاثر ہوئی اور پھر خطرناک انداز میں تیزی سے بگڑتی گئی۔ لیکن ان حالات میں بھی جون 1974ء کو اوشو نے پونا میں پہلے مراقبہ کیمپ کا انعقاد کیا اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کہ اب میرے کام کا نیا مرحلہ شروع ہوگا اور میں صرف مصدقہ متلاشیوں کے ساتھ ہی کام کروں گا۔ اب اس نے شخصی طور پر مراقبوں کے عمل کی رہنمائی سے پہلی بار ہاتھ کھینچ لیا اور اپنی بجائے ہال میں ایک خالی کرسی رکھنے کا اہتمام کروایا' یہ خالی کرسی گویا اوشو کی مراقبہ ہال میں موجودگی کی علامت تھی۔ اس تبدیلی کے بارے میں اس نے اپنے عقیدت مندوں سے کہا: "ایک اعتبار سے میں وہیں ہوں گا اور ایک اعتبار سے تمہارے سامنے ہمیشہ ایک خالی کرسی ہی رہی ہے۔"

اب اوشو نے خود کو اپنے ذاتی کمرے تک محدود کرلیا وہ صرف صبح کے خطاب کے لیے سامنے آتا اور پھر شام کو ایک یا دو گھنٹوں کے لیے اپنی رہائش گاہ سے متصل ایک چھوٹے

سے آڈیٹوریم میں ساری دنیا سے آئے ہوئے متلاشیوں کو خوش آمدید کہتا' جانے والوں کو الوداع کہتا' سوالات کے جواب دیتا اور عقیدت مندوں کے مسائل سن کر انہیں مشورے فراہم کرتا۔ جولائی 1974ء سے 1981ء تک صبح کا خطبہ اُس کا معمول رہا۔ وہ دنیا بھر کے مذاہب' عقائد اور مشاہیر کے افکار پر تبصرے کرتا اور ہر دوسرے دن حاضرین کے سوالات کے جواب دیتا تھا۔ ہر مہینے کے تینوں عشروں کی الگ الگ کارروائی تین کتابوں کی صورت میں شائع کی جاتی اور اس کے علاوہ شام کو جو افراد الگ الگ یا گروپوں کی صورت میں تبادلہ خیالات کرتے اُسے بھی پہلے ریکارڈ اور بعدازاں شائع کرنے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔

1975ء میں رجنیش نے آشرم میں لگے بندھے معمولات میں توسیع کی جس کی وجہ سے مراقبے کی مشرقی تکنیکوں کے ساتھ ساتھ تھیراپی کے مغربی طریقے بھی ایک انقلاب سے دوچار ہوگئے۔ اگست 1975ء میں اولین تھیراپی گروپوں کا آغاز ہوا۔ اب وہ صبح کے خطاب کے علاوہ شام کے وقت نئے آنے والے لوگوں کے گروپ بناتا اور گروپ لیڈروں کو ضروری ہدایات جاری کرتا۔ بعدازاں یہ مختلف گروپ مختلف درجوں کے مراقبوں میں مصروف ہوجایا کرتے تھے۔ یوں 1977ء کے اواخر تک پچاس مستقل گروپ موجود تھے اور پونا میں قائم آشرم دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ اختراعی نشوونما مرکز کے طور پر مشہور ہوچکا تھا۔ اس شہرت کا ایک سبب بڑی تعداد میں غیرملکیوں کی آمد بھی تھی جو دنیا کے مختلف ممالک سے آتے' چند ماہ گزار کے واپس چلے جاتے اور جاتے ہوئے جو کچھ بھی سیکھ کر جاتے اسے پوری تندہی سے آگے پھیلاتے تھے۔

1970ء کی دہائی کے دوران میں پونا آشرم میں تھیراپی گروپوں کی بہت ہی قلیل تعداد نے تطہیری مرحلوں یا عریانیت میں شرکت کی تاہم یہی گروپ تھے جو میڈیا کی سب سے زیادہ توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ ایک جرمن فلم کمپنی نے اجازت حاصل کرکے خصوصی طور پر مذکورہ بالا تطہیری مرحلوں اور ان کے نتائج پر ایک دستاویزی فلم تیار کی۔ ''آشرم'' نامی اس فلم نے دنیا بھر میں تنازعے اور اشتعال کو ابھارا' اس کی نمائش 1980ء کی دہائی میں ہوئی اور اوشو کے مخالفین نے اس فلم کو اپنے اس دعوے کی تائید کے لیے استعمال کیا کہ اوشو ایک خطرناک کام کررہا ہے جس کی مخالفت کی جانی چاہیے۔ دراصل مذکورہ بالا فلم میں جنسی تھیراپی کو فلمایا گیا تھا جو اوشو کے نزدیک بعض افراد کے لیے ناگزیر ہے جو زبردست جنسی دباؤ اور گھٹن کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ عمل اوشو کے بقول ''کھیل ہوا کرتا تھا' کسی کے ساتھ زنا نہیں ہوتا تھا' کسی کو اس کی رضا کے خلاف مجبور نہیں کیا جاتا تھا اور اگر کوئی کسی بھی لمحے اس سے نکلنا چاہتا تھا تو وہ نکل جانے کے لیے آزاد تھا۔ یاد رکھو! یہ گروپ ہی مقصد و مدعا نہیں

تھے' وہ تو صرف تمہیں مراقبے کے لیے تیار کرتے تھے۔۔۔ ایک مرتبہ تم ''اس سب'' کو اپنے نظام سے نکال پھینکو جس کو تم ہمیشہ دباتے رہے ہو۔''

مارچ 1976ء میں بہت سی نئی حاصل کی گئی عمارتوں کی تزئین نو اور تشکیل نو مکمل ہوگئی اور اوشو نے ان عمارتوں کو گیان یافتہ روحانی ہستیوں مثلاً عیسیٰ' کرشن' فرانسس وغیرہ سے موسوم کیا۔ اب وہ اپنے روزانہ کے خطبے کے لیے چوانگ زو آڈیٹوریم میں نمودار ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں مارچ 1977ء میں بدھ ہال کی تعمیر مکمل ہوئی جہاں اوشو کے انگریزی خطبے کو زیادہ لوگ سن سکتے تھے۔ یہ تعمیراتی سلسلہ بڑھتے بڑھتے اس قدر بڑھ گیا کہ آشرم میں پبلشنگ آفس اور پریس آفس جیسے ضروری شعبوں کے ساتھ ساتھ مختلف ہنر سکھانے کا شعبہ' شعبہ موسیقی' بوتیک اور بڑھئی خانہ بھی قائم ہوگیا.....اور پھر اگست 1977ء میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہاں ایک بیکری کے علاوہ زیورات سازی' برتن بنانے اور بنائی کے مراکز بھی کھل گئے۔ آشرم کیا تھا' بازار تھا' جس میں داخلہ بھی کچھ خرچ کیے بغیر ممکن نہ تھا۔ یہ سب کچھ اُس ہندوستان میں ہورہا تھا' جس کے باشندوں کے نزدیک آشرم کا تصور اوشو کے بنائے آشرم سے یکسر مختلف تھا۔ اسی وجہ سے اوشو نے کہا تھا:

ہندوستانی بہت مشتعل ہیں۔۔۔وہ سمجھ ہی نہیں سکتے ہیں۔ وہ صدیوں سے آشرموں کو جانتے ہیں لیکن یہ آشرم ان کی فہم سے بالاتر ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ کسی دھرم سے متعلق خطاب کو سننے کے لیے تمہیں رقم ادا کرنا پڑتی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ مفت میں سنا ہے۔۔۔ نہ صرف مفت بلکہ خطاب کے بعد آشرم ''پرشاد'' کھانا اور مٹھائی بھی تقسیم کرتا ہے۔ بہت سے لوگ خطاب سننے جاتے ہیں لیکن خطاب کے لیے نہیں بلکہ پرشاد کے لیے۔ یہاں تمہیں رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ میں کیا کررہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ مطلقاً بازار کا حصہ بن جائے' اس کی وجہ یہ ہے کہ میں خواہش مند ہوں کہ میرے سنیاسی خانقاہوں میں نہیں جائیں۔ انہیں دنیا ہی میں رہنا ہوگا۔ ان کے مراقبے کو دنیا کے اندر نشوونما پانی چاہیے' ان کے مراقبے کو فراری (Escapist) نہیں بننا چاہیے۔ سو یہاں تم خواہ کیسا ہی سکون اور شانتی پارہے ہو' تم جہاں کہیں بھی جاؤ وہاں رہنے کے قابل ہوگے۔ ادھر کوئی مسئلہ نہیں ہوگا' بالکل نہیں ہوگا۔ میں نے چیزوں کا اس طرح سے بندوبست کیا ہے کہ وہ سب کچھ جو کہیں بھی تمہیں پریشان کرسکتا ہے' یہاں موجود ہے!

اوشو نے ہندوستانیوں کے مشتعل ہونے کی بات تو کہی ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ صرف ایک ایسے آشرم کے قیام ہی کی وجہ سے ناراض نہیں تھے جو ان کے تصورات سے قطعاً مختلف تھا بلکہ اُن کی ناراضگی کی دیگر وجوہات بھی تھیں مثلاً اس آشرم میں جو کچھ بھی مراقبوں

وغیرہ کے نام پر ہوتا تھا وہ اخلاقیات کے مسلمہ اصولوں کے خلاف تھا' اوشو برسوں سے ہندو دھرم سمیت دنیا کے تمام مذاہب کی تعلیمات کو توہین آمیز انداز میں مختلف حوالوں سے جھٹلاتا رہا تھا' وہ مذاہب عالم کے تحریری ورثے کی تحقیر کرتا تھا' مذہبی رہنماؤں کا مذاق اڑاتا تھا اور عام ہندوؤں کے عقاید وتصورات کو گمراہی بتاتا تھا۔ یہی سب اور ایسی دیگر وجوہات عوام اور مذہبی وسیاسی طبقات کی ناراضگی کا باعث تھیں۔ بہرحال اسی عوامی ناراضگی کے باعث اوشو کے مغربی مقلدین خصوصاً عورتوں کو تنگ کیے جانے کے واقعات میں بھی کافی اضافہ ہوا کیونکہ ہندوستان کی جنسی ممانعتی ثقافت میں عورت اور مرد کی چاہت کے کھلے عام اظہار اشتعال انگیز سمجھا جاتا ہے۔ انہی ایام میں ہندوستانی سیاست میں اوشو کے مستقل ناقدین اور حکومتی اہلکاروں نے آشرم کے خلاف دباؤ ڈالنے والے اقدامات کا سلسلہ شروع کردیا اور نئی تعمیرات پر پابندی لگانے کے علاوہ ان غیرملکیوں کو بھارتی ویزا دینے سے بھی انکار کیا جنہوں نے ہندوستان میں اپنے ٹھکانے کے طور پر آشرم کا نام لکھا یا بتایا ہوتا تھا۔ اس مخالفت پر اوشو نے کہا:

''مجھے معاشرے کی مدد حاصل نہیں ہوسکتی ہے۔ میرا زندہ رہنا ہی ایک معجزہ ہے' یہ بہت غیر منطقی بات ہے۔ بہرحال مجھے یہاں ہونا تو نہیں چاہیے تھا۔ معاشرہ میری تائیدوحمایت نہیں کرتا ہے' وہ میری تائیدوحمایت ''کربھی نہیں سکتا''۔ ہر ممکن طریقے سے وہ میرے کام میں رکاوٹیں کھڑی کرے گا__ رکاوٹیں کھڑی کررہا ہے۔

ابھی اگلے روز ہی اخبارات میں میں نے پڑھا کہ کسی شخص نے حکومت کو تجویز دی ہے کہ مجھے ہندوستان سے نکال دیا جانا چاہیے۔ وہ ضرور دھرمی شخص رہا ہوگا کیونکہ وہ کہتا ہے کہ میں دھرم کو برباد کررہا ہوں۔ اور وہ صرف میرے وطن بدر کیے جانے ہی سے مطمئن نہیں ہے__ وہ تجویز کرتا ہے کہ میری زبان کاٹ دی جانی چاہیے تاکہ میں بول نہ سکوں' نیز میرے ہاتھ بھی کاٹ دیئے جانے چاہئیں تاکہ میں لکھ نہ سکوں۔ اور وہ سوچتا ہے کہ وہ دھرمی انسان ہے!

اس میں کیا برائی ہے؟' تم اپنے محبوب کو گلے لگاتے ہو' جس شخص سے تم محبت کرتے ہو اسے چومنے میں کیا برائی ہے؟ یہ سچ ہے کہ کسی کو زبردستی گلے نہیں لگانا چاہیے' یہ تو گند ہوتا ہے__ اور ہندوستانی یہی کررہے ہیں۔ اور میری خاتون سنیاسنیں اس امر سے واقف ہیں۔ اگر تم بازار میں موجود ہو تو ہندوستانی حقیقتاً بہت ہی گندے انداز میں سلوک کرتے ہیں۔ وہ تمہارے کولہوں میں چٹکیاں بھرتے ہیں' اب یہ تو گند ہی ہے نا! وہ تمہارے

بدن سے اپنا بدن رگڑ کر گزرتے ہیں__ یہ تو گند ہے۔ وہ تمہاری سمت یوں دیکھیں گے گویا وہ تمہیں کھا جانا پسند کرتے ہوں__ یہ گند ہے۔ لیکن اس رویئے کو وہ قبول کرتے ہیں' یہ مکمل طور پر ٹھیک ہے۔

اگر تم کسی شخص سے محبت کرتے ہو اور تم اس کے ہاتھ پکڑ لیتے ہو اور تم ایک دوسرے سے گلے ملتے ہو اور تم ایک دوسرے کو چومتے ہو تو یہ کسی کی ذمہ داری نہیں ہے۔ دوسرے کیوں برا محسوس کرتے ہیں؟ اگر وہ برا محسوس کرتے ہیں تو ان کے ساتھ کچھ گڑبڑ ہے۔ ہوسکتا ہے وہ حسد محسوس کررہے ہوں لیکن چونکہ وہ اپنے حسد کو ظاہر نہیں کرتے ہیں لہٰذا وہ غصے میں آجاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ خود کسی کو گلے لگانا چاہتے ہوں لیکن انہیں اس کی جرأت ہی نہ ہو' وہ معاشرے سے خوف کھاتے ہوں۔ لہٰذا انہیں تم پر بہت غصہ آجاتا ہے۔ جو وہ نہیں کرسکتے ہیں وہ دوسرے کسی کا بھی اسے کرنا پسند نہیں کرتے ہیں۔

سماجی اور سیاسی مداخلت کا عمل شروع ہونے پر اوشو نے کسی ایسی الگ تھلگ جگہ کی تلاش کا ذکر کرنا شروع کردیا جہاں وہ اپنا کام بغیر کسی خوف اور دخل اندازی کے انجام دے سکے۔ اب وہ اپنے خطبات میں اکثر اس ضرورت پر زور دیا کرتا تھا چنانچہ ہندوستان کے دیہی علاقوں یا کسی دوردراز کونے میں وسیع وعریض جگہ کی تلاش شروع ہوگئی' لیکن بھارت کے وزیراعظم مرارجی ڈیسائی نے جو اوشو کے مقلدین کے نزدیک روایت پرست اور کٹر ہندو تھے' یہ کوشش ناکام بنادی' انہی کے ایما پر ملک بھر کی انتظامیہ اور سرکاری مشینری کو پابند کردیا گیا کہ اوشو یا اس کے پیروکاروں کو کہیں بھی کوئی بڑا قطعہ اراضی نہ خریدنے دیا جائے۔ یوں اوشو کا یہ ارادہ پورا ہونے سے پہلے ہی دم توڑ گیا۔

قاتلانہ حملہ:

22 مئی 1980ء کو ایک بنیاد پرست ہندو تنظیم کے رکن ولاس ٹوپے نے اوشو کی جان لینے کی کوشش کی' اس نے صبح کے خطاب کے دوران چاقو سے حملہ کیا جو ناکام رہا۔ مقامی پولیس کو مخبری ہوچکی تھی اور خفیہ اداروں کے اہلکار بھی ہال میں موجود تھے لہٰذا ولاس کو فوراً حراست میں لے لیا گیا۔ اہم بات یہ ہے کہ اوشو نے اس واقعے سے ذرا بھر بھی متاثر ہوئے بغیر اپنا خطاب جاری رکھا۔ بعدازاں پولیس افسروں کی طرف سے عدالتی کارروائی میں مداخلت اور ولاس ٹوپے کی پشت پناہ ہندو تنظیم کے منفی ہتھکنڈوں کے باعث مقدمہ ختم کرکے ملزم کو بغیر مجرم ٹھہرائے رہا کردیا گیا۔ چند ہفتوں بعد اس معاملے پر اوشو کا ردعمل یہ تھا:

''پونا کے مجسٹریٹ نے اس پاگل آدمی کے مقدمے کے حوالے سے فیصلہ دے دیا

ہے' جس نے مجھ پر چاقو پھینکا تھا اور واضح طور پر مجھے قتل کرنے کی نیت سے۔ مجسٹریٹ نے اسے آزاد کر دیا ہے اور اسے آزاد کرنے کی جو وجہ اس نے بتائی ہے___ سب سے بنیادی وجہ جو اس نے بتائی ہے___ توجہ کے قابل ہے۔ میں تو اس پر ہنستا رہا ہوں' میں تو اس سے محظوظ ہوا ہوں! جس وجہ پر اس نے اسے آزاد کیا ہے' یہ ہے کہ اگر یہ مجھے قتل کرنے کی کوشش ہوتی تو پھر میں خطاب جاری نہ رکھتا! کون بولنا جاری رکھ سکتا ہے اگر کوئی شخص تمہیں قتل کرنے کی کوشش کرے؟ لیکن وہ مجھے نہیں جانتا ہے۔ اگر میں مر بھی گیا ہوتا تو میں جاری رکھتا___ میں دس بجے سے پہلے کبھی ختم نہیں کیا کرتا!

لیکن وہ سمجھ نہیں سکتا ہے___ اور میں سمجھ سکتا ہوں کہ وہ نہیں سمجھ سکتا ہے۔ جب کسی نے تمہیں قتل کرنے کی کوشش کی ہو تو کیا تم اسی انداز سے بولنا جاری رکھ سکتے ہو؟ اس کی دلیل بظاہر تو بڑی زور دار لگتی ہے۔ لہٰذا عام آدمیوں کا تو کہنا ہی کیا؟ حتیٰ کہ ایک تعلیم یافتہ مجسٹریٹ بھی اس انداز سے سوچتا ہے۔"

ان دنوں اگر ایک طرف مشرق و مغرب کے تمام مذہبی ادارے' تنظیمیں اور بارسوخ افراد رجنیش کی مخالفت میں دن رات ایک کر رہے تھے تو دوسری طرف دنیا بھر میں اُس کے باقاعدہ "نوسنیاسیوں" کی تعداد دو لاکھ پچاس ہزار سے بھی تجاوز کر چکی تھی۔

عالمگیر توسیع:

1980ء کے اواخر اور 1981ء کے اوائل میں امریکہ میں اوشو کی کتابوں' آڈیو ٹیپ اور ویڈیو ٹیپ کی تقسیم کاری کے لیے ایک مرکز قائم ہوا۔ سمندر پار عقیدت مندوں سے اپنے مقامی مراقبہ مراکز کی تائید و حمایت کرنے کو کہا گیا۔ اسی سال موسم بہار میں لندن میں "مارچ ایونٹ" کے نام سے ایک پروگرام منعقد ہوا جس میں سینکڑوں افراد نے شرکت کی۔ علاوہ ازیں دنیا کے دیگر ممالک کے دارالحکومتوں میں بھی اسی طرح کی تقریبات منعقد ہوئیں۔

پونا سے رجنیش پورم تک:

10 اپریل 1981ء کو اوشو نے متلاشیوں کے نام یہ پیغام بھیجا کہ وہ اپنے کام کے حتمی مرحلے میں داخل ہو رہا ہے لہٰذا آج سے وہ صرف خاموشی ہی کے ذریعے بولے گا۔ اس نے اپنی سیکرٹری سے میل ملاقات جاری رکھی مگر تین ہفتوں تک عام لوگوں میں نہ آیا' بعد ازاں پھر سے ست سنگ یعنی "سچی مجالس" برپا کی گئیں اور ان مجلسوں میں وہ اپنے چیلوں

اور ملاقاتیوں کے ساتھ خاموشی سے بیٹھنے کے لیے مراقبہ ہال میں رونما ہوا۔

انہی ایام میں اوشو کی صحت ایک بار پھر تیزی سے بگڑی اور انتہائی تشویشناک صورتحال پیدا ہوگئی۔ مختلف قسم کی الرجیوں کے علاوہ اب وہ شدید کمر درد میں بھی مبتلا ہوگیا تھا۔ یہ جان کر ڈاکٹروں کی فکرمندی اور بڑھ گئی کہ ریڑھ کی ہڈی کا مہرہ کھسکنے سے رجنیش کے اعصاب کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہے۔ اس بحرانی کیفیت میں اوشو کی معتمد آنند شیلا نے امریکہ روانگی کا بندوبست کیا اور یوں وہ اپنے "گھریلو" اور طبی عملے سمیت یکم جون 1981ء کو بمبئی سے نیویارک کے لیے پرواز کر گیا۔

امریکہ میں "بھگوان":

امریکہ میں اوشو کے سنیاسیوں نے اوریگان کے ایک صحرائی علاقے میں 64000 ایکڑ زمین خریدی تھی' انہوں نے اپنے گرو کو وہاں مدعو کیا اور دعوت کا جواب اثباتی پایا۔ یہاں آ کر رجنیش کی صحت تیزی سے بہتر ہوئی' اُس کی نظروں کے سامنے ایک خود انحصار اور مثالی مرکز تیزی سے ترقی کر رہا تھا جس کے نتائج بہت حیرت انگیز اور شاندار تھے۔ دراصل مویشیوں کی گزرگاہ رہ چکے' ان بنجر اور ویران علاقے کو پھر سے کاشت کاری کے قابل بنایا گیا تھا اور اس جدوجہد کا ہی ثمر تھا کہ اب قابل کاشت رقبہ پانچ ہزار افراد کی غذائی ضروریات بطریق احسن پوری کر رہا تھا۔ سالانہ تقریبات کے موقع پر جب اوشو کے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے مداح یہاں آتے تو یہ مرکز بیس ہزار سے زائد لوگوں کی بھرپور میزبانی میں کامیاب رہتا تھا۔

جلد ہی اوریگان کے مرکز کی طرز پر دیگر مغربی ممالک میں بھی مراکز قائم ہونے لگے' ایسے ممالک میں جاپان بھی شامل تھا۔ ایسا ہر مرکز اپنے آزاد کاروبار کے ذریعے اپنے وسائل پیدا کر کے چلایا جاتا تھا۔

جہاں تک اوریگان کے مرکز کا تعلق ہے تو اگست 1981ء تک اس کی حدود میں بہت سے مکانات تعمیر کر دیئے گئے تھے اور ایک خصوصی رہائش گاہ اوشو کے لیے بھی بنائی گئی تھی جس میں وہ اپنے ذاتی عملے سمیت 29 اگست کو قیام پذیر ہوا۔ اب یہ بات واضح ہونا شروع ہوگئی تھی کہ رجنیش پورم کے نام سے ایک نیا شہر آباد کیا جا رہا ہے اور اوشو کے لوگ ایک خود انحصار کمیونٹی تخلیق کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کا ارادہ پانچ ہزار رہائش گاہیں تعمیر کرنے کا تھا۔ سال میں چار بار بڑے تہوار منانا اور اوشو کی کتب کو وسیع پیمانے پر شائع کرنا بھی منصوبے میں شامل تھا۔ رجنیش پورم کی آبادی موسم بہار اور گرما گزرنے پر کافی بڑھ گئی تھی۔ اس نومولود لیکن وسیع و عریض رقبے پر محیط شہر کے باسی اگرچہ بڑی تعداد میں خیموں میں مقیم تھے مگر اُن کے پاس

بہت سے ٹرک تھے' ایک وسیع ڈیری فارم قائم ہو چکا تھا' انفراسٹرکچر قائم کرنے کے لیے تیزی سے طرح طرح کے پائپ بچھائے جا رہے تھے اور وائرنگ جاری تھی۔ سڑکیں بہتر بنانے کے علاوہ بنجر پہاڑیوں کو بھی سرسبز بنا دیا گیا تھا۔ اس صورتحال میں نئے آبادکاروں کے ساتھ اطراف و جوانب کی مقامی آبادی کی معاندت اور عداوت تیزی سے بڑھی اور جارحانہ انداز اختیار کر گئی۔ اوریگان کی ریاستی حکومت کا کہنا تھا کہ اگر مقامی لوگ نئے آنے والوں کو خوش آمدید نہیں کہتے تو انہیں واپس چلے جانا چاہیے۔ بنیاد پرست عیسائی مبلغین نے اوشو کو عیسیٰ کا مخالف قرار دے کر اس نفرت کو مزید ابھارا' نتیجہ یہ ہوا کہ نواحی علاقوں کے دیہاتوں نے رجنیش پورم کو بندوقوں کے زور سے ''فتح'' کرنے کی باتیں کیں اور رجنیش مخالف مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ علاوہ ازیں اوشو کی شبیہ پر بندوق تانے ہوئے نوجوان کی تصویر والی شرٹیں اور ٹوپیاں دھڑا دھڑ فروخت ہونے لگیں۔

اس دوران اوشو نے ایک مذہبی استاد کی حیثیت سے رہائشی پرمٹ کے لیے درخواست دی جسے اس بنیاد پر مسترد کر دیا گیا کہ وہ خاموش ہے لہٰذا وہ استاد نہیں ہو سکتا (یاد رہے کہ اوشو نے متلاشیوں سے خاموش رہ کر مخاطب ہونے کا فیصلہ کیا تھا جس کا ذکر گزشتہ سطور میں آ چکا ہے) تاہم بعدازاں اس درخواست پر فیصلہ تبدیل کر دیا گیا تھا۔

1984ء تک رجنیش پورم کا قانونی عملہ دو سو افراد سے بھی زیادہ تھا جو درجنوں مقدمات لڑنے میں مصروف تھا جو مقامی لوگوں یا حکومت کی طرف سے قائم کیے گئے تھے۔ اطلاعات کی آزادی کے ایکٹ کے تحت حاصل کی جانے والی دستاویزات سے انکشاف ہوا کہ ریگن انتظامیہ کے اعلیٰ ترین درجوں کے لوگ وفاقی اور ریاستی ایجنسیوں پر دباؤ ڈالنے میں ملوث تھے کہ جیسے بھی ہو رجنیش پورم کی صورت میں ایک خود انحصار کمیونٹی کو قائم نہ ہونے دیا جائے اور اوشو کو امریکہ سے باہر نکال دیا جائے۔ اب اوشو کا جواب بھی ملاحظہ ہو جس میں وہ امریکہ کی مرکزی حکومت کی خوب طبیعت صاف کرتا ہے:

وہ اس شہر کو اپنے زمین کے استعمال کے قوانین کے تحت ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان احمقوں میں سے کوئی ایک بھی یہ دیکھنے نہیں آیا ہے کہ ہم زمین کو کس طرح استعمال کر رہے ہیں۔ کیا وہ اس سے زیادہ تخلیقی طور پر اس کا استعمال کر سکتے ہیں جتنا کہ ہم کر رہے ہیں؟ اور پچاس برس تک تو کسی نے اس زمین کو استعمال نہیں کیا' وہ خوش تھے' وہ استعمال اچھا تھا۔

یہ صحرا ۔۔۔ بہرطور یہ تو میرے جیسے لوگوں کی منزل دکھائی پڑتا ہے۔ ہم اسے سرسبز و شاداب بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم اسے سرسبز و شاداب بنا بھی چکے ہیں۔ اگر تم میرے

گھر کے گرد چکر لگاؤ تو تم سوچ نہیں سکو گے کہ یہ اوریگوا ہے' تم سوچو گے کہ یہ تو کشمیر ہے۔

ہم نے زبردست کوشش کے ذریعے اس جگہ کو زرخیزی کی طرف مبدل کیا ہے۔ ہمارے لوگ دن میں بارہ بارہ چودہ چودہ گھنٹے کام کر رہے ہیں اور وہ یہ بھی دیکھنے نہیں آتے کہ یہاں ہو کیا رہا ہے۔ محض دارالحکومت میں بیٹھ کر وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ یہ زمین استعمال کرنے کے قوانین کے خلاف ہے۔ اگر یہ زمین استعمال کے قوانین کی خلاف ورزی ہے تو پھر تمہارے زمین کے استعمال کے قوانین بے کار (Bogus) ہیں' انہیں نذرِ آتش کر دیا جانا چاہیے۔ لیکن پہلے آؤ تو سہی اور دیکھو تو سہی اور ثابت کرو کہ یہ زمین کے استعمال کے قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ مگر وہ ہیں کہ یہاں آنے سے خوف زدہ ہیں۔

میں نے ہمیشہ امریکہ کو ایک جمہوری ملک کی حیثیت سے عزت دی ہے۔ میں نے ہمیشہ اس کی فردی' آزادی اور اظہار کی آزادی کی وجہ سے تعریف کی ہے۔ میں نے ہمیشہ امریکہ کے آئین سے محبت کی ہے۔ اور اب میں سوچتا ہوں کہ بہتر تو یہی تھا کہ میں آتا ہی نہیں' اس کی وجہ یہ ہے کہ اب میں مطلقاً مایوس ہو گیا ہوں۔ یہ آئین ناکارہ ہے۔ یہ الفاظ فرد' آزادی' سرمایہ داریت' اظہار کی آزادی ۔۔۔ سب کے سب صرف اور محض الفاظ ہی ہیں۔ پردے کے پیچھے یہ وہی سیاست دان ہیں' وہی گندے چہرے' وہی مکروہ ذہنیت ۔۔۔ کیونکہ میری رائے میں صرف دنیا کے کمینے ترین لوگ ہی سیاست کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ کمینے ترین' پست ترین لوگ' اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ وہ تبھی کچھ کر سکتے ہیں جب وہ اقتدار میں ہوں۔ تمہیں محض کچھ ضرر رساں کام کرنے کے لیے اقتدار چاہیے ہوتا ہے' دوسری صورت میں تو محبت ہی کافی ہے' رحم و ترس اور شفقت و ہمدردی ہی کافی ہے۔

تمہارا شہر انسانیت کی ساری تاریخ میں حقیقتاً ایک منفرد شہر ہے۔ یہاں شہر بھی رہے ہیں اور ویرانے (No Cities) بھی' لیکن ایک غیر قانونی شہر؟ پہلے کبھی نہیں سنا گیا۔ یہ ایک شہر تو ہے مگر غیر قانونی۔ یہ تسلیم نہیں کیا گیا ہے کہ تم ہو۔ نظر انداز کیے گئے' تم وجود ہی نہیں رکھتے ہو۔

میں یہاں ہوں اور میں یہاں رہوں گا۔ مجھے واپس بھیجنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ۔۔۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے اپنے بندوبست ہوتے ہیں۔ میں نے ہندوستانی حکومت کو خود کو رد کرنے پر قائل کیا ہے سو تم مجھے کہاں بھیج رہے ہو؟ تم مجھے صرف ہندوستان کی طرف نکال سکتے ہو۔ ہندوستان کو تو میں پہلے ہی قائل کر آیا ہوں' وہ تو بہرحال مجھے قبول نہیں کریں گے۔ ادھر کوئی راستہ نہیں ہے' مجھے نکالنے والی کوئی کرین نہیں ہے۔

مگر جو احمق اقتدار میں ہیں۔ وہ واسکو کاؤنٹی کے ماسٹر پلان میں سے رجنیش پورم کا نام تک مٹا چکے ہیں۔ واسکو کاؤنٹی کی فائلوں میں رجنیش پورم وجود ہی نہیں رکھتا ہے۔ اگر پانچ ہزار افراد دفعتاً غائب ہو جائیں تو اوریگون حکومت اتنا کہنے کے قابل بھی نہیں ہوگی کہ وہ غائب ہو چکے ہیں' وجہ یہ ہے کہ انہیں پہلے ماننا ہوگا کہ ہم یہاں موجود تھے ... جبکہ ہم تو یہاں موجود ہی نہیں ہیں!

لیکن ایک اعتبار سے یہ کاملاً بہتر ہے۔ اگر ہم اوریگون میں موجود نہیں ہیں تو پھر ہم امریکہ میں موجود نہیں ہیں۔ یہ تو ایک نئی قوم کا نیا جنم دکھائی پڑتا ہے۔ جلد ہی ہمیں اپنا آئین بنانا ہوگا اور اپنی آزادی کا اعلان کرنا ہوگا۔ اور کیا ہی کیا جا سکتا ہے؟''

خاموشی کا خاتمہ:

اکتوبر 1984ء میں اوشو نے فیصلہ کیا کہ وہ ''خاموش رہ کر مخاطب ہونے'' کی بجائے اب پہلے ہی کی طرح سنیاسیوں سے گفتگو کیا کرے گا لہذا روزانہ کا خطاب پھر شروع کر دیا گیا۔ اُس کی معتمد شیلا نے صحت کی خرابی کے باعث ایسا نہ کرنے کا مشورہ دیا لیکن یہ مشورہ مسترد کر دیا گیا۔ اسی نوعیت کے کچھ اور اختلافات کے باعث آنے والے دنوں میں مزید فاصلے پیدا ہوئے اور 14 اکتوبر 1985ء کو شیلا اپنے قریبی حامیوں کے ساتھ اوشو سے الگ ہو کر جرمنی چلی گئی۔

شیلا مجرم تھی یا سازش میں شامل؟

شیلا اور اُس کے حامیوں کے جرمنی جانے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ لوگ رجنیش پورم میں بہت سے جرائم کے مرتکب ہوئے اور اپنے پیچھے بدعنوانیوں کا ایک مربوط تانا بانا چھوڑ گئے۔ یہ انکشاف اگر ایک طرف شیلا اور اُس کے ساتھیوں کو مجرم ٹھہراتا ہے تو دوسری طرف ممکنہ طور پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شیلا نے امریکی خفیہ اداروں کے اشارے پر ہی یہ کھیل کھیلا ہوگا اور اُسے یہ یقین دہانی کرا دی گئی ہوگی کہ اگر وہ طے شدہ وقت پر طے شدہ اقدامات اور فیصلے کرے تو اُسے بلا روک ٹوک جرمنی جانے دیا جائے گا کیونکہ اُس کے اقدامات کی بنیاد پر رجنیش پورم کو برباد اور رجنیش کو ذلیل و خوار کیا جانا بہت آسان ہو سکتا تھا۔ بہرحال حقیقت جو بھی ہو لیکن واقعات کا قرینہ شیلا کی شخصیت کو ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ضرور بنا دیتا ہے۔ ہوا یوں کہ شیلا کے جانے اور بعدازاں شیلا گروپ کے غیرقانونی سرگرمیوں میں ملوث پائے جانے کے انکشافات پر اوشو نے لوگوں کو اپنی حاصل کردہ تمام معلومات سے آگاہ کیا اور

ریاستی و وفاقی تحقیقاتی اداروں کے اہلکاروں کو اپنی طرف سے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ لیکن قانون نافذ کرنے والے اداروں کے لوگ شیلا کے معاملے پر غور ہی نہیں کر رہے تھے بلکہ اُن کی نگاہ گھوم پھر کر اوشو کی ''مشکوک شخصیت'' اور رجنیش پورم کی ''غیر اطمینان بخش سرگرمیوں'' پر ہی آن ٹھہرتی تھی۔ اس دوران افواہیں پھیلنے لگیں کہ اوشو اور بہت سے سنیاسیوں کے خلاف امیگریشن قوانین کی خلاف ورزی اور دیگر الزامات عائد کرنے کے لیے ایک گرینڈ جیوری تشکیل دی جا رہی ہے۔ ان دنوں رجنیش پورم میں تفتیشی اداروں کے لوگوں کی سرگرمیاں نہایت خوفزدہ کر دینے والی تھیں' یہ دیکھتے ہوئے اوشو کے وکلاء نے پرامن سقوط کی پیشکش کی جو امریکی اٹارنی چارلس ٹرنر نے ''قبل از وقت'' قرار دے کر مسترد کر دی۔ اب پورا رجنیش پورم نیشنل گارڈز کے محاصرے میں تھا۔ خدشہ تھا کہ وہ لوگ مسلح اور جارحانہ کارروائی کریں گے لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ اوشو کو بذریعہ ہوائی جہاز شارلٹ (نارتھ کیرولینا) میں بھیج دیا جائے۔ ایسا کرنے کا جواز یہ تھا کہ کم از کم وہ فوری خطرے سے دور ہو جائے اور اُس کے وکلاء اس مہلت کا فائدہ اٹھا کر صورتحال کا رخ معلوم کر سکیں۔ بہرحال جب اوشو کا جہاز شارلٹ میں اترا تو جدید ترین اسلحے سے لیس کسٹم ایجنٹوں اور امریکی مارشلوں نے دھاوا بول دیا جنہیں خطرناک دہشت گردوں کی آمد کی اطلاع دی گئی تھی۔ بغیر تلاشی اور گرفتاری کے وارنٹوں کے افسروں نے اوریگان سے فیکس کی گئی مشکوک افراد کی فہرست پڑھ کر سنائی۔ اُن میں سے کوئی ایک بھی جہاز میں نہیں تھا لیکن اس کے باوجود اوشو سمیت سبھی کو گرفتار کر کے شارلٹ کی وفاقی عمارت میں قیدیوں کی کوٹھڑیوں میں لے جایا گیا۔

تین روز بعد عدالت لگنے کی نوبت آئی تو سماعت کے بعد اوشو کو سنیاسیوں سمیت رہا کر دیا گیا لیکن جج نے حکم سنایا کہ وہ ایک اور ضمانتی مقدمے کی سماعت کے لیے اوریگان جائے۔ اس سفر کو کئی دن تک ملتوی کیا جاتا رہا حالانکہ وہاں سے اوریگان تک کی پرواز صرف پانچ گھنٹوں کی ہے' دراصل سرکاری اہلکاروں کا اصرار تھا کہ اوشو کو ذاتی یا عام پرواز کی بجائے قیدیوں کے لیے مخصوص جہاز پر ہی لے جایا جائے گا۔ یہ دن کیسے گزرے؟ ابتداء میں تو اوشو کے وکیلوں کو بھی کچھ خبر نہ تھی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اُسے جعلی نام سے اوکلاہوما کے وفاقی اصلاحی قید خانے میں بند رکھا گیا۔ اوشو کے بقول اذیت دہی کے لیے اور حکومت کے مطابق حفاظت کے مقصد کے تحت۔

آخر کار اوشو کو اوریگان کی عدالت نے بھی ضمانت پر رہا کرنے کا حکم سنا دیا لیکن رہائی سے ٹھیک ایک گھنٹہ پہلے اوریگان کے پورٹ لینڈ جیل خانے کی اُس کوٹھڑی میں ایک بم کی موجودگی کی اطلاع ملی جس میں اوشو اور دیگر قیدی بند تھے۔ تمام قیدیوں کو وہاں سے فوراً

دوسری جگہوں پر منتقل کر دیا گیا لیکن اوشو کو وہیں ٹھہرایا گیا۔ یہ الگ بات کہ بم ناکارہ بنا دیا گیا لیکن اگر پھٹ جاتا تو ..... شاید امریکی حکومت پر الزام آئے بغیر اُن کا مقصد پورا ہو جاتا۔ بہر حال ایک گھنٹے بعد اوشو کو وہاں سے بھی رہائی مل گئی۔

قانونی پسپائی کے بعد امریکہ سے واپسی:

نومبر کے وسط میں رجنیش کے وکلاء نے اُن پر واضح کر دیا کہ چونتیس الزامات کی جو فہرست امریکی حکومت کے ہاتھ میں ہے' اُسے ہر عدالت میں جھٹلانا اور اپنا دفاع کرنا اب ممکن نہیں رہا کیونکہ ارباب اقتدار ہر قیمت پر تمہیں نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ للٰہذا دانشمندی یہی ہے کہ ہتھکڑیوں' بیڑیوں اور جیلوں کے دکھ اٹھانے کی بجائے کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر معاملہ طے کر لیا جائے۔ تذبذب کے بعد اوشو اپنے خلاف عائد چونتیس الزامات میں سے دو کے حوالے سے ''مقابلہ نہ کرتے'' اور ملک چھوڑنے پر تیار ہو گیا۔ وکلاء نے اُسے یہ یقین دلایا تھا کہ ایسا کرنے سے ہی اُس کی جان محفوظ ہو سکتی ہے۔ اوشو نے ان کی بات تسلیم کرتے ہوئے ''اولفریڈ پلی معاہدہ'' کیا جو امریکی محکمہ انصاف و قانون کی تاریخ میں ایک انوکھی مثال ہے۔ اس معاہدے کی رو سے گرو رجنیش مجرم بھی بن گیا اور معصوم بھی۔ اُسے چار لاکھ ڈالر جرمانے کی سزا دی گئی' امریکہ سے چلے جانے پر راضی کیا گیا اور یہ شرط بھی منوائی گئی کہ آئندہ پانچ سال تک وہ دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ جس دن یہ معاملات انجام پائے' اُسی دن وہ اپنے ذاتی جیٹ طیارے پر سوار ہو کر بھارت کے لیے روانہ ہو گیا۔ 14 نومبر 1985ء کو پورٹ لینڈ سے پرواز کرنے والا یہ جہاز قبرص کے راستے دہلی پہنچنے والا تھا۔ بعد میں اوشو نے ان واقعات پر کچھ یوں تبصرہ کیا کہ

جب انہوں نے مجھے رہا کیا تو مجھے حکم دیا گیا کہ فوری طور پر امریکہ چھوڑ دوں' پندرہ منٹ کے اندر اندر۔ میری کار عدالت کے سامنے کھڑی تھی اور میرا جیٹ جہاز چلتے انجنوں کے ساتھ ائیر پورٹ پر رکھا گیا تھا' مجھے فوری طور پر جو روانہ ہونا تھا۔ وہ خوف زدہ تھے کہ اگر مجھے ایک دن مزید رکھا گیا تو میں سپریم کورٹ میں اپیل کر دوں گا۔ اور میرے پاس مقدمہ جیتنے کی ہر وجہ موجود تھی' کیونکہ ان کا کوئی ایک الزام بھی ..... اس شخص کے خلاف چونتیس الزامات تھے جو خاموشی میں تھا' کبھی اپنے گھر سے نہیں نکلا تھا۔ وہ چونتیس جرم کس طرح کر سکتا تھا؟ اور ان کے پاس کسی جرم کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔

جب میں نے امریکی طرز کی جمہوریت کو عملی طور پر دیکھا ..... جمہوریت کے بارے میں بات کرنا نری بکواس ہے۔ ان کا آئین صرف دنیا کے لیے دکھاوا (شوپیس) ہے۔

مجرموں پر مشتمل ملک آزادی کی بات کرتا ہے۔''

امریکہ سے اوشو کی بھارت روانگی کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد اوریگان کے مرکز یا رجنیش پورم نامی شہر کے مکینوں نے بھی اپنے اپنے ملکوں کا رخ کیا۔ ''حسرت ہے ان غنچوں پر جو بن کھلے مرجھا گئے۔''

پہنچی وہیں پہ خاک، جہاں کا خمیر تھا۔

17 نومبر کو اوشو دہلی کے بین الاقوامی ایئر پورٹ پر اپنے جہاز سے اترا تو ہندوستان میں موجود اس کے ہزاروں مداحوں اور شیاسیوں نے اُسے خوش آمدید کہا۔ یہاں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرنے کے بعد وہ ہمالیہ کی گود میں آرام کرنے کے لیے کولومنالی کو نکل کھڑا ہوا۔ کولومنالی پہنچ کر اُس نے کئی اخبارات کو انٹرویو دیئے۔ شیاسی دوبارہ متحرک ہو کر کوئی ایسی جگہ ڈھونڈنے لگے جہاں وہ مستقلاً آباد ہو کر اپنے کام کو دوبارہ شروع کر سکے۔ لیکن ہندوستانی حکومت نے بھی اس معاملے میں امریکی انداز اپنا لیا اور اوشو کے غیر ملکی نگران' فزیشن اور دوسرے ذاتی سٹاف کے ویزوں میں توسیع سے انکار کرنے کے ساتھ ساتھ یہ دھمکی بھی دی کہ اگر وہ اخبارات کے نامہ نگاروں اور خصوصی نمائندوں سے ملاقاتوں اور مریدوں سے روابط میں لگا رہا تو پاسپورٹ بھی ضبط کروا بیٹھے گا۔

دوسری طرف ان واقعات کے کچھ عرصہ بعد امریکی اٹارنی چارلس ٹرنر نے ایک اخبار نویس کے ایک سوال کے جواب میں تین اہم باتیں کہیں۔ ایک یہ کہ ہماری پہلی ترجیح اوریگان کے خود انحصار شہر کی تباہی و بربادی تھی۔ حکومتی اہلکاروں کو علم تھا کہ اوشو کو وہاں سے نکال دینے پر یہ کام نہایت تیزی سے مکمل ہو جائے گا اور وہ ہرگز ایک اور ''فکری شہید'' پیدا کرنے پر آمادہ نہ تھے نیز اُن کے پاس کوئی ایک بھی ثبوت نہ تھا جس کی مدد سے اوشو پر کوئی ایک جرم بھی ثابت ہو پاتا۔ یہ وہ سچ تھا جو ایک سامراجی ملک کے اعلیٰ عہدیدار کے جبڑے پھاڑ کر باہر نکل آیا تھا۔

ہندوستانی حکومت کے سخت رویئے کے باعث 3 جنوری 1986ء کو اوشو نے کھٹمنڈو (نیپال) کی طرف پرواز کی۔ اوشو کہتا ہے کہ ''نیپال دنیا کی واحد ہندو سلطنت ہے لہٰذا وہاں کا بادشاہ چاہتا تھا کہ میں وہاں ضرور اپنا مرکز بناؤں اور ٹھہروں لیکن ہندومت کے خلاف کچھ نہ کہوں۔ یہ شرط مجھے منظور نہ تھی۔'' بہر حال چند روز نیپال میں قیام کیا اور روزانہ خطاب بھی چلتا رہا۔ پھر 21 جنوری 1986ء کو اوشو نے ایک اعلان کیا۔

عالمی دورے کا اعلان:

یہ اعلان کرتے ہوئے اُس نے کہا: ''میں ایک عالمی دورہ کروں گا' اس لیے کہ میں سیاسی سرحدوں کو نہیں مانتا اور ساری دھرتی کو اپنی تصور کرتا ہوں۔ تین حکومتیں مجھے مدعو کر چکی ہیں اس امر سے کاملاً آگاہی کے باوجود کہ امریکہ میرے خلاف ہے اور حکومتوں پر دباؤ ڈال رہا ہے کہ مجھے کہیں بھی جانے کی آزادی نہیں دی جانی چاہیے۔ لیکن وہ امریکہ کو دکھا دینا چاہتے ہیں: تم دنیا پر اجارہ داری نہیں رکھتے ہو۔''

یونان میں رسوائی:

16 فروری کو رجنیش چار ہفتوں کے سیاحتی ویزے پر یونان پہنچا' وہاں وہ جزیرہ کریٹ میں مقامی فلمی صنعت سے تعلق رکھنے والی ایک شخصیت کے ہاں مقیم ہوا' یہاں وہ پھر سے دن میں دو بار خطبے کا آغاز کرتا ہے تو آس پاس کے یورپی ملکوں سے سنیاسی یونان پہنچنا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ صورتحال دیکھ کر مقامی یونانی آرتھوڈوکس بشپ اپنے مذہبی اجتماعات میں اوشو کے خلاف وعظ کرتا ہے' ایک پمفلٹ لوگوں میں تقسیم کرتا ہے اور اوشو کی رہائش گاہ تک احتجاجی مارچ کی دھمکی دیتا ہے۔ اُس کے پیروکار بھی اُسی کی تان کو مزید اونچا کرتے ہوئے خون کی ندیاں بہا دینے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے' اب باقی کام تو پولیس کا تھا لہٰذا 5 مارچ کو جبکہ اوشو قیلولہ کر رہا تھا' پولیس حکومت کی ہدایت پر اسے گرفتار اور بعد ازاں ملک بدر کرنے کو پہنچی۔ رجنیش کے قانونی سیکرٹری نے جب وارنٹ دکھانے کو کہا تو پولیس نے اسے فوراً حراست میں لے لیا اور مکان میں داخل ہونے کے لیے کھڑکیاں اور دروازے توڑ دیئے۔ بھارت جانے والی اگلی پرواز پر نہ بٹھانے کے لیے یونانی افسروں کو رشوت دی گئی..... صرف 25000 ڈالر......اور وہ بک گئے۔

''ناپسندیدہ شخصیت'' کا سوئٹزرلینڈ میں داخلہ:

اب اوشو کے ذاتی طیارے نے سوئٹزرلینڈ کی طرف پرواز کی۔ لیکن وہاں اترتے ہی اس کا سات روزہ ویزا مسلح پولیس کے اعلیٰ افسروں نے مسترد کر دیا کیونکہ امریکہ میں پیش آئے واقعات کے باعث اسے ''ناپسندیدہ شخصیت'' قرار دے دیا گیا تھا۔ اسی بنیاد پر ریاستی حکام نے انہیں فوراً اپنے ملک سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اگلا پڑاؤ سویڈن تھا' وہاں اور چند دیگر ممالک میں کیا ہوا' اوشو ہی کی زبانی سنتے ہیں:

سویڈن' لندن اور آئرلینڈ کی ناکام یاترا:

ہم یہ سوچ کر سویڈن چلے گئے کہ لوگ بیان کرتے رہتے ہیں سویڈن یورپ کا یا دنیا کا سب سے زیادہ ترقی پسند (پروگریسو) ملک ہے' کہ سویڈن نے بہت سے دہشت گردوں' انقلابیوں' ملک بدر سیاستدانوں کو پناہ دی ہوئی ہے کہ وہ بہت سخی ہے۔

ہم سویڈن پہنچے۔ ہم رات بھر قیام کرنے کے خواہش مند تھے کیونکہ پائلٹوں کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ وہ مزید جہاز نہیں چلا سکتے تھے' دوسری صورت میں ایسا کرنا غیر قانونی ہوتا۔ اور ہم خوش تھے کہ ہمیں صرف رات بھر کے قیام کی اجازت دے دی گئی تھی لیکن ائیر پورٹ پر موجود آدمی نے ہر کسی کو سات دن کا ویزا دے دیا۔ لیکن جلد ہی پولیس آئی اور ویزے کینسل کر دیئے اور ہمیں رخصت ہو جانے کا کہا: ''اس شخص کو ہم اپنے ملک میں آنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔''

وہ دہشت گردوں کو تو اجازت دے سکتے تھے' وہ قاتلوں کو اجازت دے سکتے تھے' وہ مافیا کے لوگوں کو تو اجازت دے سکتے تھے اور وہ انہیں پناہ بھی فراہم کر سکتے تھے۔ لیکن وہ مجھے اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ اور میں نہ تو پناہ مانگ رہا تھا اور نہ مستقل رہائش' میں تو صرف رات بھر کے قیام کی اجازت مانگ رہا تھا۔

ہم نے لندن کا رخ کیا' اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ہمارے بنیادی حق کا مسئلہ تھا۔ اور ہم نے اسے دہرا قانونی بنایا۔ ہم نے اگلے روز کے لیے فرسٹ کلاس (درجہ اول) کے ٹکٹ خرید لیے۔ ہمارا اپنا جیٹ موجود تھا' مگر پھر بھی ہم نے ٹکٹ خرید لیے صرف اس لیے کہ وہ یہ نہ کہنا شروع کر دیں: ''تمہارے پاس کل کے ٹکٹ تو ہیں نہیں' سو ہم تمہیں فرسٹ کلاس لاؤنج میں قیام کی اجازت نہیں دیں گے۔''

ہم نے ہر شخص کے ٹکٹ خرید لیے صرف اس لیے تاکہ ہم لاؤنج میں قیام کر سکیں اور ہم نے انہیں بتایا: ''ہمارے پاس اپنا جیٹ ہے' اور ہمارے پاس ٹکٹیں بھی ہیں۔'' لیکن انہوں نے ائیر پورٹ کے ایک ضمنی قانون کا سہارا لیا کہ کوئی شخص مداخلت نہیں کر سکتا: ''یہ ہمارا اختیار ہے۔ اور اس آدمی کو ہم لاؤنج میں آنے کی اجازت نہیں دیں گے۔''

میں حیران تھا: ''میں ان کی اخلاقیات' ان کے مذہب کو لاؤنج میں بولنے سے کس طرح تباہ کر سکتا ہوں؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں سو رہا ہوں گا اور صبح کو ہم چلے جائیں گے۔'' لیکن نہیں' یہ نام نہاد مہذب ملک اتنے ہی وحشی اور جنگلی ہیں جتنا کہ تم تصور کر سکتے ہو۔ انہوں نے کہا: ''ہم جو کچھ کر سکتے ہیں' وہ یہی ہے کہ ہم تمہیں رات بھر کے لیے جیل میں بند

کر سکتے ہیں۔"

آئرلینڈ میں ہم صرف ایک دن کا قیام چاہتے تھے تاکہ ہمارے پائلٹ آرام کر لیں۔۔۔ جو آدمی ائیرپورٹ پر موجود تھا' اس نے ہمیں سات روز دے دیئے۔ اس نے کوئی پروا نہیں کی کہ ہم کون ہیں' ہمارا کیا مقصد ہے۔ وہ ضرور نشے میں رہا ہوگا! ہم ایک ہوٹل پہنچے اور صبح ہوتے ہی پولیس پہنچ گئی' پاسپورٹ مانگے اور ان سات دنوں کو منسوخ کر دیا۔

ہم نے کہا: "تم ہمیں سات دن دے چکے ہو اور اب بغیر وجہ بتائے انہیں منسوخ کر رہے ہو۔ ہمارا کوئی آدمی ہوٹل سے باہر نہیں نکلا ہے' کسی نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ تم ایسا نہیں کر سکتے ہو۔"

وہ مشکل میں پھنس گئے۔ انہوں نے سات دن دیئے تھے' اب انہوں نے منسوخ کر دیا تھا اور ان کے پاس بتانے کے لیے کوئی وجہ نہیں تھی کہ کیوں۔ سو انہوں نے کہا: "تم جب تک چاہو قیام کر سکتے ہو' لیکن ہوٹل سے باہر مت جانا۔"

ہم وہاں پندرہ دن رہے کیونکہ ہمیں کچھ مہلت درکار تھی۔ ہمارے لوگ سپین میں کام کر رہے تھے اور سپینی حکومت مجھے مستقل رہائش دینے کے لیے آمادہ تھی۔ سو ہم صرف مہلت چاہتے تھے' اگر سپین راضی ہو جاتا تو ہم آئرلینڈ سے سپین روانہ ہو سکتے تھے۔ ہم آئرلینڈ میں بغیر کسی ویزے کے پندرہ دن مقیم رہے۔

اور جس روز ہم نے آئرلینڈ چھوڑا ہے' ایک وزیر نے اراکینِ پارلیمنٹ کو بتایا کہ ہم کبھی آئرلینڈ میں رہے ہی نہیں ہیں۔ مہذب لوگ' تعلیم یافتہ لوگ۔۔۔ اور سیدھا سیدھا جھوٹ بولتے ہوئے' یہ کہتے ہوئے کہ میں کبھی آئرلینڈ میں رہا ہی نہیں ہوں! اور وہ جانتا تھا کہ اس کی حکومت کو علم ہے' پولیس چیف کو علم ہے۔

میں سوچ رہا ہوں کہ میں ایک مرتبہ کہیں مقیم ہو جاؤں تو پھر شروع کروں گا۔۔۔ ایک ایک کر کے ہر ملک کو ان کے جھوٹ بولنے پر مجھے "خطرناک" کہنے پر ہاں کہنے اور ایک گھنٹے بعد رد کر دینے پر عدالت میں گھسیٹوں گا۔ میں اس سادہ سی تفہیم کے بعد اسے دنیا پر منکشف کروں گا کہ کہیں کوئی جمہوریت نہیں ہے۔"

سپین کا وعدہ ...... لیکن ...... وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہوگیا

سپین نے 14 مارچ کو اوشو اور اس کے ساتھیوں کو ویزے دینے کا وعدہ کیا لیکن صرف تین دن بعد ہی امریکی حکومت کی طرف سے ڈالے جانے والے دباؤ کے نتیجے میں وہ سارے وعدے بھول گیا۔ اب سپین ویزا دینے سے انکاری تھا۔ لیکن اس انکار کے بعد بھی

جب 18 مارچ کو اوشو کا جہاز میڈرڈ میں اترا تو وہی ہوا جس کی توقع تھی' گارڈیا سول (Guardia Civil) نے فوراً جہاز کا محاصرہ کر لیا اور بھری ہوئی بندوقیں تان لی گئیں لیکن اس موقع پر یوراگوئے کا قونصل مدد کے لیے آگے آ گیا۔

یوراگوئے ......اُمید کی آخری کرن:

یوراگوئے کے اسپینی قونصل نے اپنی حکومت کی ہدایت پر اوشو اور اس کے ہمراہیوں کے پاسپورٹوں پر اپنے ملک کے ویزوں کی مہریں لگا دیں اور بظاہر ایسا کر کے اس نے امریکی دباؤ کو نظر انداز کر دیا۔ ویزوں کے حصول کے بعد اوشو اور اس کے ہمنواؤں کی اگلی منزل سینی گال تھا جہاں انہوں نے یوراگوئے پہنچنے سے پہلے رات بھر ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ اسی روز یورپی پارلیمنٹ میں ایک قرارداد پر بحث ہوئی جس میں کہا گیا تھا کہ اوشو کو یورپی دولت مشترکہ کے کسی بھی ملک میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ اس حوالے سے تبصرہ کرتے ہوئے اوشو نے کہا:

"تم حیران ہو گے کہ میں ان ملکوں کی پارلیمانوں میں زیرِ بحث آیا ہوں جہاں میں کبھی رہا ہی نہیں' حتیٰ کہ ان ملکوں میں بھی جہاں میرا کوئی ایک بھی سنیاسی موجود نہیں ہے گویا میں ان کے لیے دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ وہ تیسری ایٹمی عالمی جنگ کا سامنا کر رہے ہیں لیکن ان کو فکر میری پڑی ہوئی ہے!

یہ بات اہم ہے کہ انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ اگر مجھے درس دینے کی اجازت دی جاتی ہے تو ان کے گلے سڑے معاشرے منہدم ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اور میں کچھ بھی ہو جائے جاری رہوں گا' وہ مجھے نہیں روک سکتے۔ میں اپنے راستے ڈھونڈ نکالوں گا۔ اور اب میں ان کے خلاف دلائل کو پہلے سے زیادہ تیز کر لوں گا اور ہر اس حکومت کے بارے میں عیاں کر ڈالوں گا' جو مجھے میرے لوگوں تک پہنچنے سے روکتی رہی ہے۔"

...... چراغوں میں روشنی نہ رہی:

21 اپریل کو اوشو پنٹا ڈیل ایسٹے' یوراگوئے میں سمندر کے قریب واقع ایک رہائش گاہ میں مقیم ہو گیا۔ ابھی سفر کی تھکن بھی نہ اترنے پائی تھی کہ اس نے ایک خفیہ انتظام کے تحت روزانہ صرف بیس سے تیس افراد کی چھوٹی چھوٹی جماعتوں کو خطبہ دینے کا آغاز کر دیا۔ یہ سرگرمی اس نے اپنا مستقبل محفوظ دیکھ کر ہی شروع کی تھی لیکن آنے والے دنوں میں کیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب کسی کو معلوم نہ تھا۔

یوراگوئے کی حکومت نے اصل میں اوشو کو ایک سال تک قیام کا اجازت نامہ عطا کیا تھا' اس عندیہ کے ساتھ کہ اس کو تین سال تک کے لیے توسیع دے دی جائے گی اور آخر میں اسے شہریت عطا کر دی جائے گی۔ تاہم جون کے اوائل میں اوشو کو قیام کرنے کی اجازت نہ دینے کے حوالے سے وہ امریکیوں کے دباؤ میں آ گئی۔ جون کے وسط میں امریکی حکومت نے یوراگوئے کے صدر کو الٹی میٹم دے دیا کہ یا تو اوشو کو ملک بدر کر دیا جائے یا اربوں ڈالر کی امریکی امداد کھونے کا خطرہ مول لیا جائے۔ وہ تذبذب کے ساتھ اس پر عمل کرتا ہے۔

یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہوا؟ آیئے اوشو ہی سے معلوم کرتے ہیں:

یوراگوئے کے صدر نے کہا: "بدقسمتی سے مجھے ایسا کرنا پڑے گا۔ میں اپنے ضمیر کے برخلاف کر رہا ہوں۔"

امریکی اس حوالے سے کوئی بھی رعایت دینے پر رضامند نہیں تھے کہ مجھے ملک چھوڑ دینا ہو گا۔ میرا جہاز ایئرپورٹ پر انتظار کر رہا تھا...... میں نے کہا: "کوئی بات نہیں ہے میں ملک چھوڑ سکتا ہوں۔ میں آپ کے ملک کو اس طرح کے خطرے میں نہیں ڈالوں گا۔"

اس نے کہا: "امریکی صدر کا اصرار ہے کہ آپ کو ملک سے نکال دیا جانا چاہیے۔ آپ کو ملک بدر کیے بغیر ملک سے نہیں جانا چاہیے۔ مجھے جرائم کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اوّل آپ کو بغیر وجہ بتائے ملک چھوڑنے کا کہنا جبکہ آپ نے کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ دوم آپ کو ملک بدر کرنا لیکن میں مطلق طور پر بے بس ہوں۔ اب بھی میں ایک بات کا خواہش مند ہوں کہ آپ کے پاسپورٹ پر یوراگوئے سے ملک بدری کی مہر نہیں لگنی چاہیے۔ ہمارے پاس ایک چھوٹا ایئرپورٹ ہے...... لہٰذا اپنے جہاز کو اس ایئرپورٹ پر لے جائیں اور شام کو ہمیں اطلاع دیئے بغیر روانہ ہو جائیں تاکہ ہم کہہ سکیں کہ "وہ ہمیں اطلاع دیئے بغیر نکل گیا ہے۔ اسے ملک بدر کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔"

مگر وہ غلطی پر تھا۔ جونہی میرا جہاز چھوٹے ایئرپورٹ کی طرف گیا' ایک امریکی نمائندہ لوگوں کو ملک بدر کرنے والے افسر اور تمام مہروں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ مجھے وہاں دیر لگ گئی' اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں تمام فارم پُر کرنا پڑے تھے اور جونہی میں نے ملک چھوڑا' میں نے کہا: "کوئی بات نہیں ہے۔ درحقیقت میرا پاسپورٹ ایک تاریخی دستاویز بن چکا ہے! مجھے بہت سے ملکوں سے بغیر کسی وجہ کے ملک بدر کیا گیا ہے۔"

"جب میں یوراگوئے سے نکل گیا تو صدر کو فوری طور پر امریکہ مدعو کیا گیا اور

رونالڈ ریگن نے اسے "دوستی کی علامت" کے طور پر 36 ملین ڈالر دیئے۔ وہ ایک انعام تھا کہ مجھے 36 گھنٹوں کے اندر اندر نکال باہر کیا گیا تھا۔ پورے 36 ملین ڈالر۔ ایک ملین ڈالر فی گھنٹہ۔ درحقیقت مجھے ان حکومتوں سے اپنا حصہ مانگنا شروع کر دینا چاہیے تھا! تم میری وجہ سے اربوں ڈالر حاصل کر رہے ہو...... مجھے کم از کم دو فی صد تو ملنا ہی چاہیے۔"

بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے:

19 جون 1986ء کو اوشو نے یوراگوئے سے جمیکا کی طرف پرواز کی' اگرچہ وہاں کے لیے دو ہفتے کا ویزا اُسے مل گیا تھا لیکن جمیکا پہنچنے کے بعد اگلی ہی صبح پولیس نے اسے شام تک وہاں سے ہر صورت میں نکل جانے کا حکم دیا۔ سوال یہ ہے کہ اگر اگلے ہی دن گرو رجنیش کو جمیکا سے نکال دیا جانا تھا تو پھر اسے دو ہفتے کا ویزا ہی کیوں دیا گیا تھا؟ اور آخر ایسی کیا مجبوری آن پڑی تھی کہ اوشو کو ہنگامی طور پر وہاں سے رخصت کرنے کا فیصلہ کیا گیا؟ ان سوالات کے جواب میں اوشو کے عقیدت مند کہتے ہیں کہ ہمارا جہاز وہاں اترنے کے چند ہی لمحے بعد امریکی فضائیہ کا ایک طیارہ بھی آ وارد ہوا تھا اور اُس کے اندر سے سادہ لباس میں ملبوس دو افراد نے نکل کر جمیکا کے اعلیٰ حکام سے ملاقات کی تھی جس کے نتیجے میں انہیں اپنا فیصلہ تبدیل کرنا پڑا۔ بہرحال نئی صورتحال میں اوشو نے 20 جون کو میڈرڈ کے راستے لزبن' پرتگال کی طرف اڑان کی' وہاں اُسے اور دیگر فضائی آوارہ گردوں کو فوری طور پر تو قبول کر لیا گیا اور ایک بنگلے میں ٹھہرایا گیا لیکن چند ہی ہفتے بعد ایک روز اچانک جدید ترین اسلحے سے مسلح ریاستی اہلکاروں نے بنگلے کا گھیراؤ کر لیا۔ یہ گرو کی طرف سے اپنا خطبہ جاری کرنے کا نتیجہ تھا کیونکہ مقامی انتظامیہ نے انہیں صرف بنگلے کی حد تک محدود رہنے اور کسی بھی قسم کی تحریر و تقریر سے گریز کرنے کا حکم دیا تھا...... اب اوشو کے لیے پوری دنیا میں ایک ہی ملک ایسا بچا تھا جہاں وہ اپنی زندگی کے باقی دن قدرے سکون سے گزار سکتا تھا' لہٰذا اُس نے طیارے کا رخ بھارت کی طرف پھیر دیا اور پھر اپنے مرنے تک وہ بھارت ہی میں مقیم رہا۔

پھر وہی بھارت:

29 جولائی 1986ء کو اوشو ایک بار پھر بمبئی (بھارت) آن اترا۔ یہاں وہ اپنے ایک شاگرد کے گھر پر چھ ماہ تک بطور مہمان مقیم رہا' اس دوران عقیدت مندوں کی آمد و رفت بھی ہونے لگی اور روزانہ خطاب کا معمول بھی پھر سے پرانی ڈگر پر آ گیا۔ اب اُسے ایک بار پھر پونا کے آشرم کی یاد ستانے لگی جسے اس کی عدم موجودگی میں کسی نہ کسی طرح چلایا جا رہا تھا۔

پھر وہی آشرم:

4 جنوری 1987ء کو وہ پھر سے پونا میں قائم اپنے آشرم میں گیا' جہاں امریکہ روانگی سے قبل اُس نے کئی سال تک قیام کیا تھا۔ اوشو کے آشرم آنے کی خبر پونا کی پولیس تک بھی پہنچ چکی تھی لہٰذا مقامی انتظامیہ نے اسے آدھے گھنٹے کے اندر اندر شہر سے نکل جانے کا حکم دیا' الزام یہ تھا کہ وہ ایک متنازعہ آدمی ہے جس کی شہر میں موجودگی کے باعث فسادات کی آگ بھڑک سکتی ہے۔ لیکن اوشو کی طرف سے اس حکم کو اسی دن بمبئی کی اعلیٰ عدالت میں چیلنج کر دیا گیا اور عدالت کی طرف سے حکم امتناعی جاری ہو گیا۔

وہی ہندو نوجوان ولاس توپے جس نے اوشو کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی' انتہا پسند ہندو تنظیموں کی پشت پناہی پا کر ایک بار پھر میدان میں آ گیا اور نت نئی دھمکیاں دینے لگا۔ اس نے اعلان کیا کہ اگر گرو رجنیش کو فی الفور پونا بدر نہ کیا گیا تو وہ اپنے نجی طور پر تیار کردہ سینکڑوں کمانڈوز کے ساتھ آشرم پر حملہ کر کے اس شیطانی ادارے کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔

خفیہ دوستوں کی امداد:

دیگر شدت پسند حلقوں کی طرف سے بھی اسی قسم کا شدید ردِعمل سامنے آیا۔ تاہم چند ماہ بعد پونا کے میئر ڈھولے پٹیل اور عدلیہ و انتظامیہ میں موجود اپنے خفیہ دوستوں کی امداد و اعانت سے رجنیش کو پونا کا آشرم محدود انداز میں چلانے کی اجازت مل گئی۔ اب ایک طرح سے گرو آزاد تھا لیکن یہ آزادی صرف پنجرے کے اندر یعنی آشرم کی حد تک حاصل تھی' پونا کے سابقہ دور میں وہ جتنے ہمہ گیر انداز میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھا' اس کا تو اب خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ اس گھٹن نے اوشو کی تیزی سے بیماری کے حصار میں محصور کرنا شروع کر دیا اور آخرکار وہ زندگی کی شاہراہ سے اُس ڈھلان کی طرف لڑھکنے لگا جو موت کی کھائی تک لے جاتی ہے۔

کیا اوشو کو قتل کیا گیا؟

1987ء کے اواخر تک پونا مرکز کے دروازوں سے ہزاروں سنیاسی اور عقیدت مند اسے ملنے کے لیے اندر داخل ہوئے اور باہر گئے ... لیکن ان کے ''بھگوان'' کی قوت اور مزاحمت ہر نئے دن کی آمد کے ساتھ پہلے سے مزید کم ہوتی جا رہی تھی اور یہ سب کچھ ہوتا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کی ہڈیوں اور ہڈیوں کے جوڑوں کا درد بہت بڑھ چکا تھا'

دیکھنے کا عمل بھی اذیت ناک ہو گیا تھا کیونکہ آنکھیں اب تیز روشنی کا سامنا نہیں کر سکتی تھیں' بھوک خطرناک حد تک کم ہو گئی تھی اور کانوں کی انفیکشن کے علاوہ دیگر کئی امراض بھی حملہ آور ہو چکے تھے۔ اس صورتحال کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ روزانہ خطبات کو جاری نہ رکھ سکا' یہاں تک کہ بعض اوقات دنوں یا ہفتوں تک وہ اپنے چاہنے والوں سے مخاطب نہ ہو پاتا' لیکن جب بھی موقع ملتا وہ یہی کہتا کہ میں ہمیشہ تمہارے درمیان نہیں رہوں گا لہٰذا مراقبے کو اپنی ترجیح بنا لو' یہ بہت قیمتی متاع ہے۔

انہی دنوں ایک بار ایسا بھی ہوا کہ وہ بیماری اور علاج کی غرض سے مسلسل سات ہفتے تک منظرِ عام پر نہ آ سکا اور جب آیا تو اس کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ ایک دھماکہ خیز انکشاف بن گئے' غیر حاضری کے اس لمبے وقفے کے بعد وہ 6 نومبر 1987ء کو رونما ہوا اور اعلان کیا کہ جب میں امریکی جیلوں میں بند تھا تو مجھے سست روی سے قتل کرنے کے ایک خاص زہر دیا گیا تھا۔ آیئے اوشو کی زبانی ہی یہ اعلان سنتے ہیں

''میرے فزیشن ڈاکٹر امریتو نے ساری دنیا میں موجود میرے سنیاسی ڈاکٹروں کو فوری اطلاع کر دی اور زہر خورانی کے بہترین ماہروں سے رابطہ کرنے کا کہا کیونکہ اس کا اپنا تجزیہ تو یہ تھا کہ جب تک مجھے زہر نہ دیا گیا ہو اس وقت تک میرے جسم کے ساری مزاحمت کھو دینے کے مسئلے کی وضاحت کا کوئی امکان نہیں تھا اور جونہی یہ خیال اس کے ذہن میں پختہ تر ہوتا چلا گیا' رفتہ رفتہ اس نے معاملے کی تفتیش اور چھان بین شروع کر دی اور وہ تمام علامات پا لیں جو صرف تبھی رونما ہو سکتی تھیں اگر مجھے کسی قسم کا زہر دیا گیا ہو۔

امریکی قید خانوں میں گزارے ہوئے بارہ دنوں ہی سے نیند اُڑ گئی ہے۔ جسم میں بہت سی ایسی چیزیں رونما ہونا شروع ہو گئی ہیں جو پہلے کبھی رونما نہیں ہوئی تھیں یعنی بھوک کا ختم ہو جانا' غذا کا مطلق طور پر بے ذائقہ محسوس ہونا' معدے میں اتھل پتھل' متلی' قے کی خواہش سی محسوس ہونا...... پیاس کا احساس نہیں بلکہ ایک حیرت ناک احساس گویا کسی کو جڑ سے اُکھاڑ دیا گیا ہو۔ اعصابی نظام میں لگتا ہے کوئی شے متاثر ہوئی ہے۔ بعض اوقات سارے جسم پر جھرجھری کا سا احساس ہوتا رہا ہے جو کہ بہت مضبوط تھا ... خاص طور پر میرے دونوں ہاتھوں میں ... اور آنکھوں کے پپوٹوں کا پھڑکنا۔

جس روز میں جیل میں داخل ہوا تھا' میں ایک سو پچاس پونڈ کا تھا' آج ... صرف ایک سو تیس پونڈ کا ہوں اور صرف تین ماہ پہلے میرے سیدھے ہاتھ کی ہڈی میں شدید درد

شروع ہوگیو۔ یہ تمام علامات خاص زہروں کی ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر امریتو نے فوری طور پر میرے ان سب سنیاسیوں کو اطلاع دی جو کہ ڈاکٹر تھے کہ وہ دنیا کے زہروں کے تمام بہترین ماہروں سے رابطہ کریں اور ان میں سے ایک ڈاکٹر دھیان یوگی نے فوری طور پر میرے خون کے نمونے' پیشاب کے نمونے' میرے بالوں کے نمونے لیے اور برطانیہ اور جرمنی میں بہترین ماہرین کے پاس گیو۔ یورپی ڈاکٹروں نے کہا کہ کوئی زہر ایسا نہیں ہوتا جس کا دو سال بعد جسم کے اندر سراغ لگ سکے لیکن تمام علامتیں ظاہر کرتی ہیں کہ کوئی خاص زہر دیا گیا ہے۔

برطانیہ اور جرمنی کے یورپی ماہروں نے تھیلیئم تشخیص کیا جو کہ بھاری دھاتوں کے زہروں کے خاندان کا حصہ ہے۔ یہ جسم سے آٹھ ہفتوں کے بعد غائب ہو جاتا ہے لیکن اپنے اثرات چھوڑ جاتا ہے اور بیماریوں کے خلاف جسم کی مزاحمت کو تباہ و برباد کر دیتا ہے اور وہ سب علامات جو میں نے تمہیں بتائی ہیں' تھیلیئم زہر خورانی کا حصہ ہوتی ہیں۔

مجھے ان لوگوں سے کوئی شکایت نہیں ہے جنہوں نے مجھے زہر دیا۔ میں انہیں آسانی سے معاف کر سکتا ہوں۔ یقیناً وہ نہیں جانتے ہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ تاریخ خود کو دہراتی ہے۔ یہ تاریخ نہیں ہے جو خود کو دہراتی ہے بلکہ یہ تو انسان کا لاشعور ہے' انسان کی نابینائی ہے جو کہ خود کو دہراتی ہے۔ جس روز انسان باشعور' چوکس اور آگاہ ہوگا تب ادھر مزید کوئی دہرائی' کبھی نہیں ہوگی۔ سقراط کو زہر نہیں دیا جائے گا' عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب نہیں کیا جائے گا۔ منصور الحلاج کو قتل اور ذبح نہیں کیا جائے گا اور یہ ہمارے بہترین پھول ہیں۔ وہ ہماری سب سے اعلیٰ ترین چوٹیاں ہیں۔ وہ ہماری منزلیں ہیں' وہ ہمارا مستقبل ہیں' وہ ہمارا باطنی جوہر ہیں جس نے حقیقت میں ڈھلنا ہے۔

میں اپنے اندر مطلق یقینیت رکھتا ہوں کہ ممکن ہے وہ میرے جسم کو' میرے اعصابی نظام کو زہر دینے کے اہل رہے ہوں لیکن وہ میرے شعور کو تباہ نہیں کر سکتے' وہ میری ہستی کو زہر نہیں دے سکتے اور یہ بہتر ہی ہے کہ انہوں نے مجھے میرے جسم سے ماورا' میرے ذہن سے ماورا دیکھنے کا موقع مہیا کر دیا ہے۔

میں تم سب کا بھی اسی عظیم مسرت تک رسائی پانا پسند کروں گا' اسی مستی تک جو کہ عین میرے دل کی دھڑکن بن چکی ہے' یہ ساری کائنات کے بھی دل کی دھڑکن ہے۔''

اس اعلان کے بعد 17 جنوری 1988ء کو اوشو نے آشرم کے لیے ایک ایسے وژن کے بارے میں خطاب کیا جس کے مطابق ایک ایسے مقام اتصال کو تخلیق کرنے کی ضرورت

ہے جہاں لوگ مادے کی خارجی سائنس اور مراقبے کی داخلی سائنس ... ہر دو کو دریافت کر سکیں۔ یہ وہ تجویز تھی جس پر وہ ماضی میں بھی بات کرتا رہا تھا۔ یہ ''سائنسوں کی عالمی اکیڈمی برائے تخلیقیت'' تھی جس کا خواب اوشو نے دیکھا تو ضرور مگر وہ عملی طور پر اس حوالے سے کچھ نہ کر سکا کیونکہ موت اب بہت قریب تھی۔

19 مارچ 1988ء کو اُس نے خطبات کی وہ سیریز شروع کی جو صرف سوالوں کے جواب کے لیے وقف آخری سیریز بن گئی۔ 30 اپریل کو اوشو نے اعلان کیا کہ اس نے ''مراقباتی تھیراپی'' کے نام سے ایک نیا عمل پروان چڑھایا ہے۔ یہ عمل تین ہفتوں کے دورانیے پر محیط اور روزانہ تین گھنٹے کے تجربات پر مشتمل تھا۔ اس مدت میں ایک ہفتہ ہنسنے کا' ایک رونے کا اور ایک آخری ہفتہ خاموشی سے دیکھنے کا رکھا گیا تھا۔ اس عجیب و غریب ''مراقباتی تھیراپی'' کے بارے میں بتاتے ہوئے اوشو نے کہا تھا: ''میں نے بہت سے مراقبے ایجاد کیے ہیں مگر یہ سب سے زیادہ جوہری اور بنیادی مراقبہ ہوگا۔''

اس کے بعد کچھ عرصہ تک رجنیش نے عالمی و علاقائی معاملات اور مذہبی و غیر مذہبی ادبیات کے حوالے سے اپنے خطبات تو جاری رکھے لیکن اب سابقہ باقاعدگی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اُس کی صحت اب اتنی گر چکی تھی کہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ ''صبح گیا یا شام گیا۔''

......اور ''بھگوان'' مر گیا!

دسمبر 1988ء میں بیماری نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ اسے چوبیس گھنٹے اپنے فزیشن اور معالجین کے حاضر رہنے کی ضرورت پیش آنے لگی۔ تین ہفتے کی طویل غیر حاضری کے بعد وہ ایک بار پھر مراقبہ ہال جا پہنچا اور یہ چونکا دینے والا اعلان کیا:

''گوتم بدھ نے مجھ میں پناہ لی ہوئی ہے۔ میں میزبان ہوں' وہ مہمان ہے۔'' چند روز بعد وہ ایک اور اعلان کے ساتھ مراقبہ ہال میں آیا اور کہنے لگا' گوتم بدھ جا چکا ہے' کیونکہ مہمان اور میزبان کے طرز زندگی میں خاص یکسانیتیں نہیں تھیں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اُس نے ہدایت کی کہ مجھے آج سے بھگوان کی بجائے ''شری رجنیش زوربا بدھ'' کہہ کر مخاطب کیا جائے اور پھر جلد ہی یہ حکم ملتوی کر کے کہا کہ میں بے نام ہوں مجھے کسی بھی نام سے مخاطب نہ کیا جائے۔ عقیدت مندوں کے لیے اس نئی ہدایت نے بہت بڑی الجھن پیدا کر دی' وہ بے چارے اب کیا کہہ کر اپنے گرو کو بلاتے؟ سوچ و بچار کے بعد انہوں نے ''اوشو'' تجویز کیا جو کہ عزت و احترام کی ایک اصطلاح ہے' وہ مان گیا اور ساتھ ہی اُس نے اس لفظ کو ولیم جیمز کے ''اوشیانک'' سے جوڑتے ہوئے اپنے ہی معنی نکال لیے۔ پھر ایک بار اُس نے یہ اعلان

کیا کہ ''اوشو'' بھی بہرحال میرا اپنا نام نہیں ہے۔ اب اُس کے ہر کام میں ایک تیزی آ گئی تھی اور حقیقتاً یہ بجھنے سے پہلے چراغ کی آخری بھڑک تھی۔ گوتم کے مذکورہ بالا دورے کے بعد وہ خوب آتش بیان ہو گیا اور بغیر تھکے مسلسل بولنے لگا حالانکہ کچھ عرصہ قبل نقاہت اور بیماری کے سبب ایسا ہونا محال تھا...... دو بار تو وہ بلا رکے مسلسل چار گھنٹے تک بولتا رہا۔

لیکن فروری 1988ء میں یہ شعلہ بیانی پھر سے زبان کی لکنت اور لڑکھڑاہٹ میں تبدیل ہونے لگی' اس بار وہ اپریل کے آغاز تک مراقبہ ہال میں نمودار نہ ہو سکا تھا...... دن گزرتے گئے...... اور ایک سال اسی طرح بیت گیا...... آج 10 اپریل 1989ء ہے اور اوشو عوام میں اپنے آخری الفاظ ادا کر رہا ہے: ''اس لمحے تم دھرتی پر سب سے زیادہ رحمت یاب انسان ہو۔ خود کو بدھ (عارف) کے طور پر یاد رکھنا سب سے زیادہ قیمتی تجربہ ہے' کیونکہ یہ تمہاری ابدیت ہے' یہ تمہاری لافانیت ہے......''

اس سے چند روز پہلے 6 اپریل 1989ء کو وہ اپنا ''اندرونی حلقہ'' تشکیل دے چکا تھا جو اکیس عقیدت مندوں پر مشتمل تھا۔ اسے وہ اپنے بعد کمیون (مرکز یا آشرم) کو چلانے اور مزید آگے بڑھانے کے لیے ہدایات دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اکیس رکنی اندرونی حلقہ ہمیشہ قائم رہنا چاہیے' اگر کوئی رکن مر جائے یا کسی وجہ سے الگ ہو جائے تو اس کی جگہ نیا آدمی شامل کر لیا کرنا اور یہ شمولیت اتفاق رائے سے ہوگی۔

19 مئی 1989ء کو مراقبہ ہال میں ایک عمومی اجلاس کے دوران اعلان کیا جاتا ہے کہ اوشو اب دوبارہ کبھی عوامی خطاب نہیں کرے گا...... اور اب ذیل کی جھلکیوں میں ملاحظہ فرمائیں کہ اوشو کے آخری چند ماہ کیسے گزرے اور وہ کس طرح موت کی بے رحم بانہوں کی طرف بڑھتا ہی چلا گیا

23 رمئی...... اعلان کیا جاتا ہے کہ اوشو شام میں مراقبہ ہال میں آیا کرے گا جب وہ آئے گا تو موسیقی بج رہی ہوگی تاکہ ہر کوئی اس کے ساتھ خوشی منا سکے اور اس کے بعد خاموش مراقبے کا دور ہوگا' جس کے بعد اوشو چلا جائے گا۔ اس کے خطبوں کی ایک ویڈیو اس کے ہال سے چلے جانے کے بعد دکھائی جایا کرے گی۔

جون' جولائی...... اوشو ملٹی ورسٹی (Multiversity) قائم کر دی جاتی ہے جس میں کمیون کی طرف سے پیش کیے گئے متعدد پروگراموں اور ورکشاپوں کی دیکھ بھال کے لیے مختلف ''شعبے'' (فیکلٹیز) ہوتے ہیں۔

25 راگست...... اوشو تجویز دیتا ہے کہ کمیون کے اندر ہونے والی دن کی تمام سرگرمیوں کے دوران میں قرمزی لبادے پہننے کے انتظامات کیے جائیں۔

31 راگست...... اوشو کی رہائش گاہ سے متصل چوانگ زو سماعت گاہ (آڈیٹوریم) میں اس کے لیے نئی خواب گاہ مکمل ہو جاتی ہے۔ وہ نئے کمرے کے ڈیزائن کی تیاری میں خود حصہ لیتا ہے جس میں سنگِ مرمر لگا ہوتا ہے اور جو بڑے شمع دانوں سے روشن ہوتا ہے۔ فرش سے چھت تک کھڑکیاں بنی ہوتی ہیں جن سے اردگرد کا باغ دیکھا جا سکتا ہے۔

17 رنومبر...... اوشو ہدایات دیتا ہے کہ جب وہ اپنے جسم کو چھوڑے تو کیا کیا ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ وہ اپنی کتابوں کو ہندی سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لیے ایک گروپ تشکیل دیتا ہے اور اندرونی حلقے کے کام کرنے کے حوالے سے مزید ہدایات جاری کرتا ہے۔

24 ردسمبر...... سنڈے میل برطانیہ اوشو کے امریکہ سے نکالے جانے میں ویٹیکن کے ذمہ دار ہونے کے حوالے سے ایک مضمون شائع کرتا ہے۔

17 رجنوری 1990ء...... اوشو کا فزیشن اعلان کرتا ہے کہ اب وہ شام کے مراقبے کے دوران مراقبہ ہال میں بیٹھنے کے قابل نہیں ہے لیکن اجتماع کو خوش آمدید کہنے کے لیے قلیل وقت کے لیے آئے گا اور فوری طور پر لوٹ جائے گا۔ جب اوشو ہال میں نمودار ہوتا ہے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ بہت نازک ہے اور اپنے پیروں پر مستحکم نہیں۔

18 رجنوری...... اوشو شام کے اجلاس کے دوران میں اپنے کمرے میں ہی رہتا ہے لیکن ایک پیغام بھیجتا ہے کہ اس کی موجودگی یوں محسوس کی جائے گویا وہ وہیں موجود ہو۔

19 رجنوری 1990ء:...... اوشو دن کے پانچ بجے اپنے جسم کو چھوڑ دیتا ہے' اپنے ڈاکٹر کے تجویز کردہ غیر معمولی علاج کو یہ کہہ کر رد کرتے ہوئے کہ ''ہستی اپنے وقت خود طے کرتی ہے۔'' اور شانتی کے ساتھ اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے اور روانہ ہو جاتا ہے۔ اس کا ڈاکٹر سات بجے اعلان کرتا ہے' جب لوگ معمول کے شام کے اجلاس کے لیے مراقبہ ہال میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو اطلاع دینے کے ایک مختصر سے وقفے کے بعد' جو کہ ہال میں نہیں تھے مگر آنے کے خواہش مند تھے' اوشو کا جسم دس منٹ کے میلے کے لیے ہال میں لایا جاتا ہے' پھر ایک جلوس کی صورت میں قریبی مرگھٹ پر لے جایا جاتا ہے جہاں ساری رات اس کا الوداعی میلہ برپا رہتا ہے۔

دو روز بعد اوشو کی راکھ چوانگ زو سماعت گاہ میں لائی جاتی ہے...... وہ کمرہ جس کو ''خواب گاہ'' کے طور پر نئے سرے سے بنایا گیا تھا...... جہاں وہ کئی برس خطبے دیتا رہا تھا اور سنیاسیوں اور متلاشیوں سے ملاقاتیں کرتا رہا تھا۔ اوشو کی ہدایت کے مطابق راکھ کو ''بستر کے نیچے'' رکھ دیا جاتا ہے...... کمرے کے ایک کونے کے مرکز میں سنگِ مرمر کا تختہ جس کو بستر کے

پلیٹ فارم کے طور پر ڈیزائن کیا گیا ہوتا ہے..... اور ایک آرائشی لوح سے ڈھانپا جاتا ہے جس پر وہ الفاظ کندہ ہوتے ہیں جو اس نے چند ماہ پہلے لکھوائے تھے:

اوشو
نہ کبھی پیدا ہوا
نہ کبھی مرا
صرف اس دھرتی کا دورہ کیا
1930ء۔1990ء کے دوران میں

یوں بیسویں صدی کا متنازعہ ترین آدمی ہمیشہ کے لیے یہ دنیا چھوڑ گیا جس کے کونے کونے کو اُس نے اپنی انتہائی منفرد اور سماج کے اکثریتی طبقوں کے لیے ناقابل قبول سرگرمیوں اور خیالات سے چونکا کر رکھ دیا تھا۔

نانا نانی کے ہاں پرورش پانے والا تنہائی پسند بچہ .....اپنے باپ اور ماں سے بے نیاز لڑکا.....ایک خود پسند اور بے باک طالب علم..... فلسفے کا پروفیسر..... آچاریہ کے بھیس میں اپنے افکار کی ترویج کرنے والا معلم..... بھگوان کہلانے والا انسان اور شری رجنیش زور با بدھ بننے والا گیانی..... اوشو کے نام کے ساتھ موت کی وادی میں اتر گیا.....اُس پر امیروں کا گرو ہونے کے ساتھ ساتھ خود ساختہ بھگوان اور جنسی طور پر گمراہ اور گمراہ کن شخص ہونے کے الزامات عائد کیے گئے.....اور بھی بہت کچھ کہا گیا۔ جو کچھ کہا گیا وہ سارے کا سارا سچ تھا نہ جھوٹ۔ اسی طرح جو کچھ اوشو نے کیا اور کہا.....وہ بھی تمام کا تمام جائز قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ناجائز.....''بھگوان'' کی موت کے بعد اس کا تشکیل دیا گیا اندرونی حلقہ آج بھی متحرک ہے اور 1990ء سے 2002ء کے اختتام تک پونا میں اوشو کمیون انٹرنیشنل مراقبے اور خود دریافتی کے ایک بہت بڑے مرکز کے طور پر فعال اور مسلسل وسعت پذیر ہے۔

❁ ❁ ❁

ایک روحانی صوفی گرو کی آپ بیتی

اوشو

(گرو رجنیش)
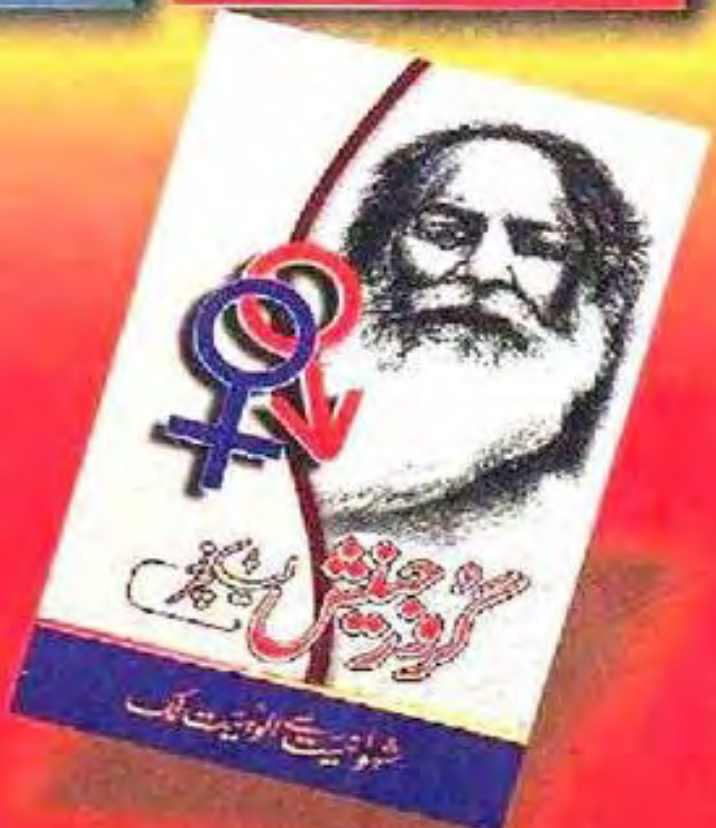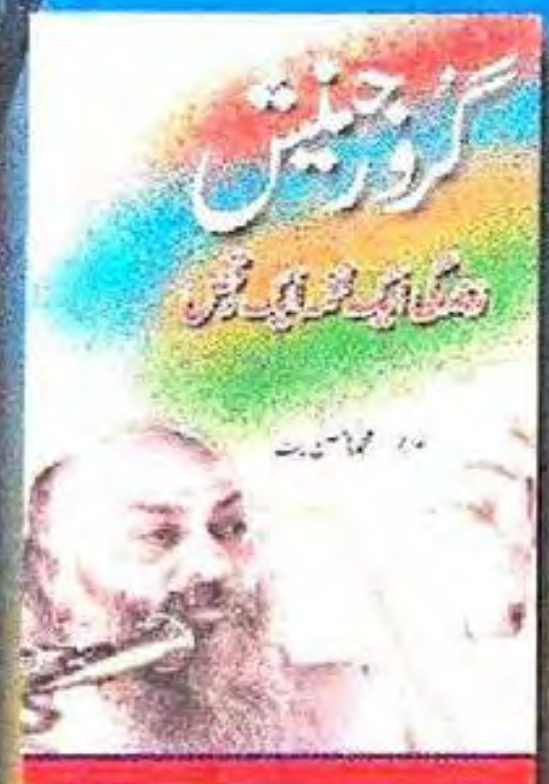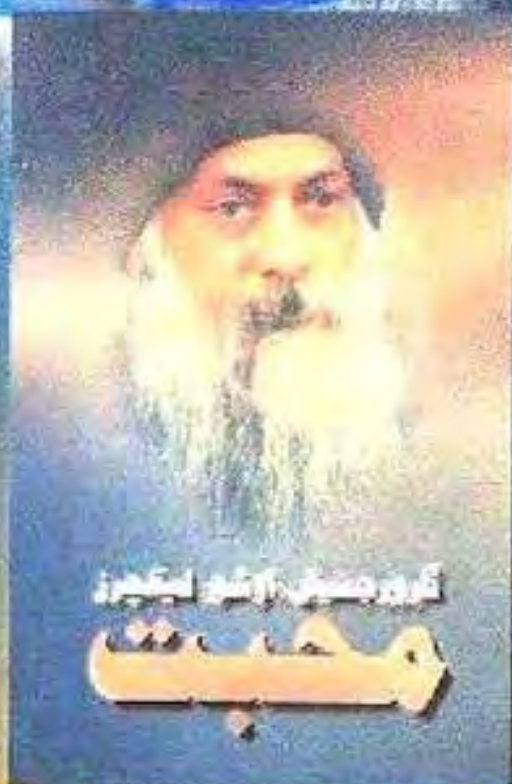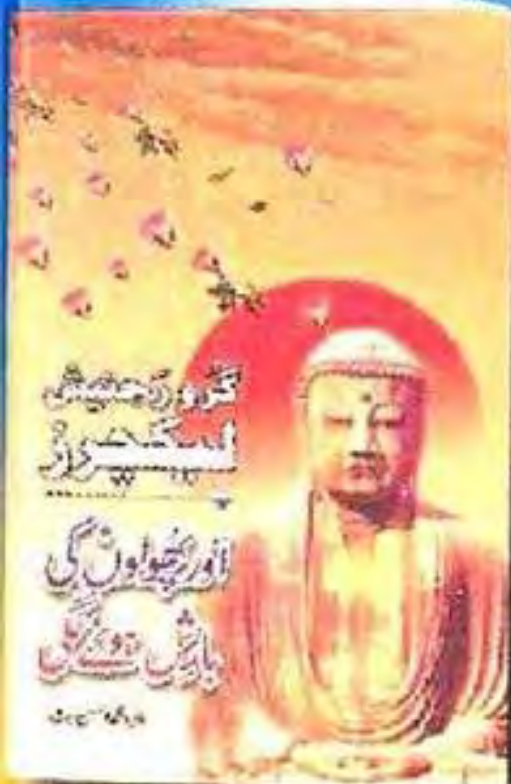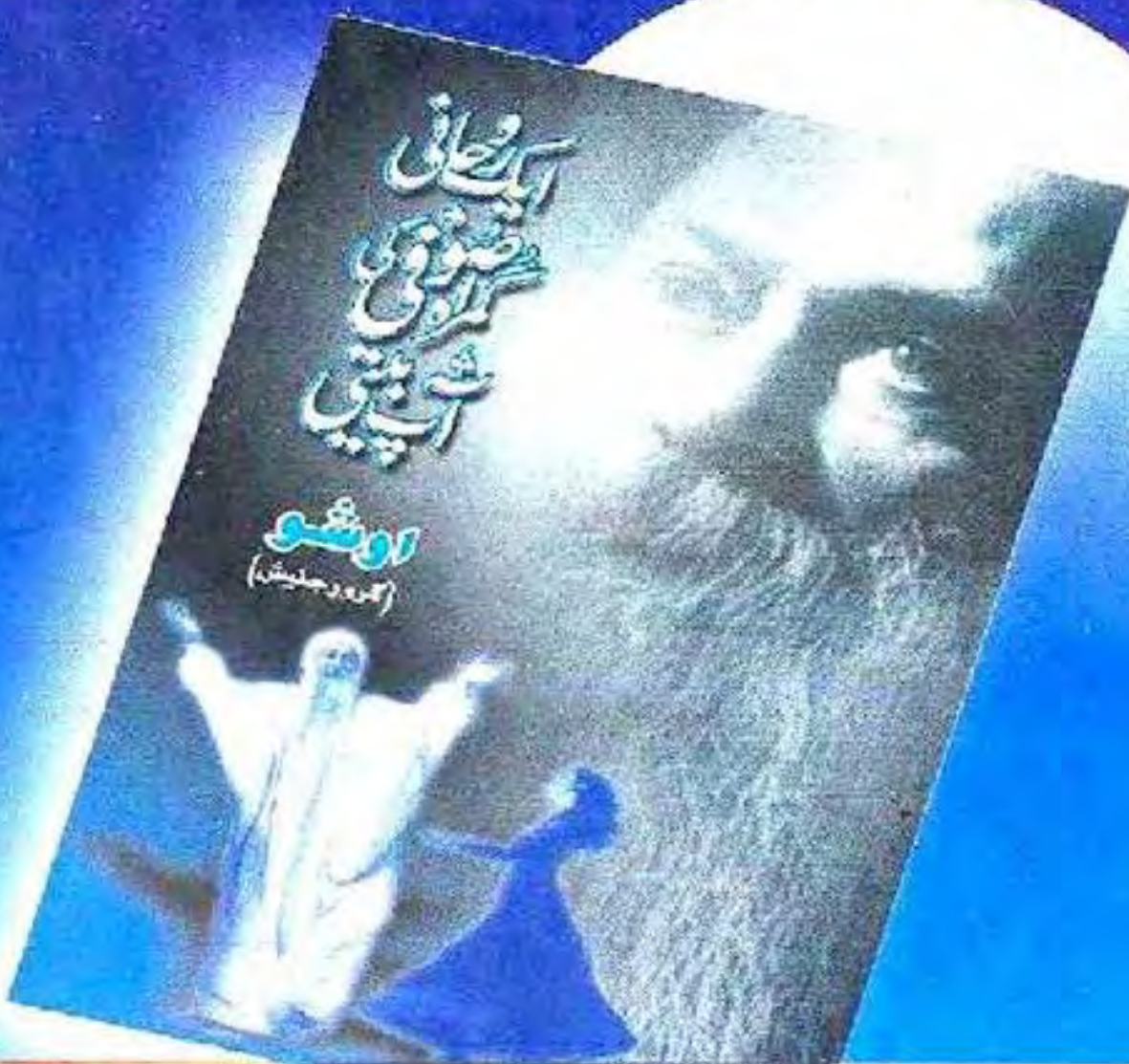
24 مزنگ روڈ، لاہور پاکستان فون نمبر: 92-42-7322892

E-mail: nigarshat@wol.net.pk

E-mail: nigarshat@yahoo.com